میثاق لکھنو میں قائداعظم کا کردار: ایک تحقیقی جائزہ

سید مبشر حسین شاہ*

ڈاکٹر فضل ربی**

Abstract

It is a reality that earlier Jinnah was a devoted champion of Hindu Muslim unity, and he convinced all India Muslim league to change their policies for the better of India. In 1915, mainly due to his efforts, both the Muslim league and the Congress came closer and had their annual meeting in Bombay. At the end of this meeting, a committee was formed bring harmony between the two communities i.e., Muslims and Hindus. The committee prepared a scheme in November, 1916. The scheme was approved by both the parties in December, 1916 at the respective sessions at Lucknow. This paper deals with the role of role of Quaid-i-Azam in the execution of Lucknow Pact.

حکومت برطانیہ نے اگرچہ ابتداء میں ایماندارانہ طریقے سے تجارت کو فروغ دیا بعدازاں وہ انسانیت کی حدود سے نکل کر درندے بن بیٹھے اور کچھ نہیں کرنا چاہیئے تھا وہ بھی کر گزرے۔ یہاں تک کہ اس کی ہوس دولت اور حرص ملک گیری نے اسے بادشاہت تک پہنچا دیا اور ۱۷۵۷ء میں انہوں نے بدعہدیوں اور بے وفائیوں کی شرمناک صورت میں جنگ پلاسی شروع کر دی اور غداروں کی وجہ سے کامیابی حاصل کر لی۔ جس کی وجہ سے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو گیا چاروں طرف ظلم و ستم شروع ہو گیا دولت سمیٹنے اور مظالم کا شکار کرنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں تھی ہر چیز پر اپنا قبضہ جما لیا گیا اور ہر طریقے سے ہندوستانی خوشحالی کو ختم کر دیا گیا۔ دولت کے دریا انگلستان کو جانے لگے اور افلاس اور ہلاک کرنے والی آندھیاں ہندوستانیوں پر چاروں طرف سے آنی

---

* طالب علم ایم فل، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔

** ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ مطالعہ پاکستان، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد۔

شروع ہوگئیں۔

بروکس(Mr. Brooks)اسی زمانے کے بارے میں کہتا ہے۔

''یہ مالا مال خزانے کروڑوں آدمیوں کی صدیوں کی کمائی انگریزوں نے ہتھیا کر لندن کی طرف بھیج دی۔جس طرح رومن نے یونان اور پونٹس کے خزانے اٹلی بھیج دیئے تھے۔ ہندوستانی خزانے کتنے قیمتی تھے۔کوئی انسان بھی اس کا اندازہ نہیں کرسکتا۔لیکن وہ کروڑوں اشرفیاں ہوں گی۔اتنی دولت اس وقت کی مجموعی یورپین دولت سے بہت زیادہ تھی''۔(۵٦)

سرجان شور(Sir John Shore) کہتا ہے۔

''لیکن ہندوستان کا عہد زریں گزر چکا ہے جو دولت کبھی اس کے پاس تھی اس کا جزو اعظم ملک کے باہر کھینچ کر بھیج دیا گیا ہے اس کے قوائے عمل اس بدعملی کے ناپاک نظام نے معطل کر دیئے ہیں جس نے لاکھوں نفوس کی منفعت کو چند افراد کے فائدہ کی خاطر قربان کردیا''۔(۵۷)

(۵٦) پروین وزینہ، جمعیت علمائے ہند، جلد دوم،قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، مرکز فضیلت قائداعظم یونیورسٹی نیو کیمپس اسلام آباد، ۲۰۱٦ء، ص ٦٦۳

(۵۷) ایضاً ص ٦٦۳

سائمن کمیشن (رائل کمیشن) نے اپنی مرتب کردہ رپورٹ کے حصہ اول جس میں ہندوستان کے سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو اجاگر کیا گیا ہے لکھا ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کو علاقائی اور سیاسی اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ تقسیم تاج برطانیہ نے خصوصی تعاون، تعاون اور عدم تعاون کی بنیاد پر کی گئی تھی۔یعنی تاج برطانیہ نے ان صوبوں کو گورنر کے صوبے کا درجہ دیا جو کہ تاج برطانیہ سے تعاون کرتے تھے۔ جو کہ مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) پنجاب، (۲) بہار، (۳) اڑیسہ، (۴) آسلے، (۵) برما (٦) وسطی صوبہ بریر اور یہ گورنری صوبے کہلاتے تھے۔

ان میں سے چار صوبے ایسے تھے جو تاج برطانیہ کے ساتھ خصوصی تعاون کرتے تھے اس بنا پر تاج برطانیہ نے انہیں پریزڈینسی خاص کے صوبہ جات کا درجہ دیا ہوا تھا۔ جو کہ مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) مدراس، (۲) سندھ اور (۳) بنگال

ایسے صوبہ جات جو تاج برطانیہ سے عدم تعاون کرتے تھے انہیں تاج برطانیہ نے گورنر کے صوبوں سے

نیچے کا درجہ یعنی کمشنری صوبوں کا درجہ دیا ہوا تھا۔ جو کہ مندرجہ ذیل تھے۔

(۱) شمال مغربی سرحدی صوبہ (موجودہ خیبر پختونخواہ)، (۲) بلوچستان، (۳) دہلی، (۴) اجمیر، (۵) کورک اور (۵) اندرامن نکوبار کے جزیرے شامل تھے۔

تاج برطانیہ اسی فارمولے کے تحت اپنی اصلاحات کرتی تھیں۔ سائمن کمیشن رپورٹ کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاج برطانیہ کے ساتھ بہت زیادہ تعاون کرنے والے صوبوں میں یعنی پریزیڈنسی خاص کے صوبوں کی جغرافیائی، معاشی، معاشرتی اور سیاسی حیثیت سب سے نمایاں نظر آتی ہے۔ اسی طرح گورنری صوبوں کی جغرافیائی معاشی، معاشرتی، سیاسی حیثیت پریزیڈنسی خاص کے صوبوں سے مختلف نظر آتی ہے۔ اور اسی طرح کمشنری صوبوں کی جغرافیائی معاشی، معاشرتی، اور سیاسی حیثیت گورنر صوبوں سے مختلف نظر آتی ہے۔(۵۸)

(۵۸) Indian Statory Commission, Vol I, Calcutta, Government of India Central Publication branch, 1930, Page 54

تلخیص

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مطلق العنان رجعت پسند، تکلیفوں کا احساس نہ کرنے والے ڈائریکٹوں اور جرنیلوں کے سیاہ کارناموں سے آگاہی پر تاج برطانیہ نے ہندوستان کو اپنے زیر سایہ لینے اور اس کا براہ راست انتظام کرنا ضروری سمجھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے پونے چار کروڑ پونڈ کے بدلے ہندوستان کو خرید لیا۔ (افسوس کا مقام ہے کہ وہ پیسہ ابھی تک ہندوستان پر قرض چلا آ رہا ہے اور ہندوستان کو اس پیسے کا سالانہ سود در سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ جس کو بیچا گیا تھا اسی سے قیمت دلوائی جا رہی تھی۔ برطانوی حکومت نے افریقہ وغیرہ میں نائیگریا وغیرہ کو بھی کمپنیوں سے ہی خریدا تھا۔ تاہم ان کی قیمتیں "تاج برطانیہ کے خزانوں سے ادا کی گئیں") ملکہ برطانیہ نے اپنے مشہور اعلان کی ہندوستان میں اشاعت کی اور تمام ہندوستانیوں کو ان کے مستقبل سے متعلق اطمینان دلایا اور اہل ہندوستان مطمئن ہوگئے اور انہوں نے یقین کر لیا کہ شاہی اقتدار سچائی اور انصاف کے تحت ہماری پوری حفاظت کرے گا۔(۱۳۳)

لارڈ میکالے لکھتا ہے:

"اس طریقے سے بے شمار دولت بہت جلد کلکتہ میں جمع ہوگئی۔ درآنحالیکہ تین کروڑ انسان حد درجہ برباد

کر دیئے گئے۔ بے شک ان لوگوں کو مظالم میں رہنے کی عادت تھی۔مگر وہ مظالم اس قسم کے نہ تھے۔کمپنی کی چھٹی انگلی میں انہیں سراج الدولہ کے چھٹے سے زیادہ موٹی معلوم ہوتی تھی‘‘۔(۱۳۰)

۱۷۶۲ء میں نواب بنگال نے انگریزی گورنر کو مندرجہ ذیل الفاظ لکھے تھے:۔

’’کمپنی کے ملازمان رعایا اور سوداگروں کا مال چوتھائی قیمت پر لے لیتے ہیں اور اپنے ایک روپیہ کے سامان کی قیمت ان سے پانچ روپے وصول کرتے ہیں‘‘۔(۱۳۱)

لارڈ میکالے لکھتا ہے۔

’’کمپنی کے عیوب میں محض ظلم ہی نہ تھا بلکہ ظلم سے ایسے خراب نتائج پیدا ہوتے تھے جیسا کہ دولتمند بننے کے لیے اصول حرص سے پیدا ہوتے ہیں‘‘۔(۱۳۲)

(۱۳۰) پروین روزینہ جمعیت علمائے ہند،قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت اسلام آباد،۲۰۱۶ء،ص۶۶۲

(۱۳۱) ایضاً،۶۶۲

(۱۳۲) ایضاً،۶۶۲۔۶۶۳

۱۶۶۱ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی اندرون و بیرون مشکلات کا شکار رہی۔ ہندوستان کے اندر مختلف بندرگاہوں پر اس نے بغرض تجارت اپنی کوٹھیاں قائم کر دیں۔ان کے کے انتظام وانصرام کے لیے انگلستان کے بادشاہوں سے مراعات لی جاتی رہیں۔ ہندوستان کے عوام پر پہلی دفعہ حکمرانی کرنے کا موقعہ کمپنی کو اس وقت ملا جب بمبئی کا جزیرہ اور متعلقہ بندرگاہ شاہ پرتگال جانب سے برطانیہ کو جہیز میں دیا گیا اور اسکا نظم ونسق کمپنی کے حوالے کر دیا گیا۔سترہویں صدی کے آخر میں کمپنی کو اپنا سکہ چلانے،عدالتیں قائم کرنے اور ان کے قواعد وضوابط ترتیب دینے اور آرڈیننس کے اجراء کے اختیارات مختلف چارٹرز کی رو سے حاصل ہوتے ہیں۔☆

☆ عذرا وقار،تحریک پاکستان اور نوائے وقت،قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت،مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد،۲۰۰۴ء،ص ص ۴۴۸-۴۴۹۔

اٹھارہویں صدی کے وسط میں پہلی دفعہ کمپنی نے مدارس کے اندر ہندوستانی سپاہیوں پر مشتمل مختصرسی فوج رکھی جسکی بدولت پلاسی کی لڑائی اور کلائیو کی فتوحات حاصل کرنے کے بعد کمپنی کو مزید اختیارات تفویض کیے گئے۔ وہ دور کمپنی کے ملازمین کے لیے سنہرا دور تھا۔کمپنی کے ملازمین جھولیاں بھر بھر کرلے جاتے۔شاہی خاندان کے افراد سمیت چھوٹے سے چھوٹے طبقے کے انگریز بھی کمپنی کی ملازمت حاصل کرنے کے خواہشمند

نظر آتے تھے۔ تمام افراد کا مقصد صرف یہی تھا کہ ہندوستان دولت کو انگلستان تک پہنچایا جائے۔ اس وقت کا ہندوستان اور اسکا مال و دولت انگریزوں کا مرکز نگاہ بنا ہوا تھا۔

☆ عذرا وقار، تحریک پاکستان اور نوائے وقت، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۴۴۹۔

میر جعفر ہندوستان کے ماتھے پر ملک کا وہ ٹکہ جسکی غداری کی وجہ سے بنگال کے تمام اختیارات تاج برطانیہ کو حاصل ہو گئے۔ اس دوران بنگال کی دیوانی کمپنی کو حاصل ہو گئی جسکی رو سے مالیہ، اراضیات، کسٹم ڈیوٹی، سول گورنمنٹ اور مال نظم ونسق سمیت تمام اختیارات کو کمپنی کو حاصل ہو گئے۔ اس صورت حال کے نتیجہ میں ولایت سے آئے ہوئے منچلوں اور اایروں غیروں نے اس دوعمل نظام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا۔ نواب کی حکومت برائے نام تھی عملاً تمام اختیارات کمپنی کے پاس تھے۔ اس شرمناک صورت حال کو دیکھتے ہوئے پارلیمنٹ نے خود مداخلت کر کے ۱۷۷۳ء کا ایکونیکٹنگ ایکٹ منظور کیا گیا جس کے ذریعے ملازمین کی کمپنی لوٹ مار کی روک تھام کے لیے ہیسٹنگز کو فورٹ ولیم کا گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ تاریخ گواہ ہے گورنر جنرل اور اس کے کونسلرز رشوت ستانی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگے۔ ہیسٹنگز کے شرمناک کارنامے اور دردناک مظالم برطانیہ کے دامن پر نہایت بدنما قسم کے دھبہ ہیں۔

☆ عذرا وقار، تحریک پاکستان اور نوائے وقت، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۴۴۹۔

بالآخر پارلیمنٹ نے ۱۷۸۳ء کے ایکٹ کے ذریعے اصلاح احوال کی کوشش کی اور ہندوستان معاملات کی جانچ پڑتال کے لیے لندن میں ایک بورڈ آف کمشنر مقرر کیا جس سے ہندوستان کی سول اور فوجی حکومت پر معمور کیا گیا۔ گورنر جنرل کے کونسلرز کی تعداد کو بڑھا کر تین کر دیا گیا اور لارڈ کارنوالس جسکی دیانت کو سب تسلیم کرتے تھے انہیں گورنر جنرل مقرر کیا گیا۔ انہیں نظم ونسق سے متعلق بہت زیادہ اختیارات دیے گئے۔

☆ عذرا وقار، تحریک پاکستان اور نوائے وقت، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۴۴۹-۴۵۰۔

۱۸۵۷ء تک سلطنت ہندوستان بہت تیزی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے نیچے آتی چلی گئی۔ دہلی کے شہنشاہ کی حکومت صرف برائے نام تھی، حقیقت صرف یہ تھی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی دن بدن طاقتور ہوتی جا رہی تھی۔ سلطنت کا اندرونی نظم ونسق اس حد تک بگڑ گیا تھا نیز اس کے علاوہ طوائف الملوکی کی وباء اتنی پھیل چکی تھی

کہ دیسی راجاؤں اورنوابوں کا کسی بھی طریقے سے رعب یا دبدبہ نہیں تھا۔ان کی ریاستیں ہر لحاظ سے کھوکھلی ہو چکی تھیں اور چاروں طرف انتہائی بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔آہستہ آہستہ اودھ، منجوا، کرناٹک، آگرہ، دہلی، پھڑانچ کمپنی کے مقبوضات میں شامل کر لی گی۔مرہٹوں کی مسلسل شکستوں سے پیشواء اور دوسرے راجپوت راجہ کمپنی کی اطاعت کرنے پر مجبور ہو گئے۔اودھے پور، دھولپور، جے پور، کوئٹہ، بھوپال، بھوندی وغیرہ تمام ریاستی کمپنی کے حلقہ اقتدار کے اندر آگئیں۔۱۸۱۸ء میں اجمیر اور نربدا کا جنوبی علاقے کو بھی فتح کرلیا اور اسی سال کاکن اور کاٹھی کا بھی کمپنی سے الحاق ہوگیا۔گوالیار، اندور، وہاڑ، دیواس کے راجاؤں نے بھی ایسٹ انڈا کمپنی کی ااعت کو بھی قبول کرلیا۔اسی طرح آسام، تناسرم، کچھا، جنیتا اور ساتھ ہی گورکھا اور صورت کے پرانے علاقوں کا الحاق بھی ہوگیا۔تاوقتیکہ ۱۸۵۹ء تک سندھ اور پنجاب میں بھی تاج برطانیہ کا جھنڈا بھی لہرانے لگا۔(۱۲۵)

(۱۲۵) عذرا وقار، تحریک پاکستان اور نوائے وقت، قومی ادارہ برائے تحقیق، تاریخ وثقافت، سنٹر آف ایکسی لینس قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۴، ص ۴۸۰

سائمن کمیشن نے اپنی مرتب کردہ رپورٹ کے حصہ اول میں ہندوستانی ریاستوں کی مختلف خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

سائمن کمیشن (رائل کمیشن) رپورٹ کے مطابق ہندوستانی ریاستیں جغرافیائی، معاشی اور سیاسی مختلف نمایاں خصوصیات کی حامل ہیں۔مواصلات کے لئے اہم شاہراہیں ریاست کے اندر اور باہر نقل وحرکت کے لئے ضروری ہیں اور فلاح وبہبود کے لئے برطانوی علاقوں کی سرحدوں سے کئی بار گزرتی ہیں۔ان کے درمیان برطانوی علاقے کے علاوہ کوئی اور سرحد نہیں ہے۔ایسی سرحدیں جو برطانوی ہندوستان کو تقسیم کرتی ہیں۔کسی قاعدہ کے طور پر، کوئی بھی واضح خصوصیت پیش نہیں کرتیں۔ایک حد اس وجہ سے مقرر کی گئی ہے کہ ریاستوں کی حدود علاقائی طویل عرصہ پہلے یا برطانوی توسیع کے دنوں میں گفت وشنید اور معاہدے کے نتیجے میں رکھی گئی تھیں۔ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی ریاست کی سیاسی نقطہ نظر نسلی یا لسانی ڈویژنوں کے ساتھ متفق ہوتا ہے مثلاً، سکھ ریاستوں کے مقابلے میں پنجاب کے صوبوں میں زیادہ سکھ ہیں: اور مرہٹہ حکمران کے زیر سایہ مرہٹہ کم اور بمبی پریڈنسی میں زیادہ مرہٹے نہیں ہیں دوسری طرف، کناری بولنے والے افراد کا بڑا حصہ میسور مہاراجہ کے زیر سایہ ہے، جبکہ دیگر بمبئی اور مدراس پریسڈنسی کے کچھ حصوں میں رہتے ہیں۔(۱۲۶)

مختلف ریاستوں کی اندرونی حکومت کافی مختلف ہوتی ہے۔ان میں سے تیس ریاستوں میں ایک

مشاورتی قانون ساز کونسل بنائی گئی ہے۔ چالیس ریاستوں میں مکمل یورپی ماڈل کی بنیاد پر ہائی کورٹ، بنائی گئی ہیں۔ عدالتی افعال سے ایگزیکٹو کو الگ کرنے کے لیے دعویٰ ہے۔ اعلیٰ درجے کی اور زیادہ پسماندہ ریاستوں کی طرف سے انتظامی کارکردگی میں ایک بہت بڑا فرق ہے۔ ان میں سے سب سے بہتر اعلی معیار حاصل کرنے والی ریاست پر فخر ہے۔(۱۲۷)

(۱۲۶) Indian Statory Commission, Vol I, Calcutta, Government of India Central Publication branch, 1930, Page 84-85

(۱۲۷) Ibid Page 85

تاج برطانیہ نے ۱۷۷۳ء میں ایگلولیٹنگ ایکٹ کے تحت ہندوستان کے گورنر جنرل اور کونسل کو یہ اختیار دیا کہ وہ بنگال کی حکومت کو بطریق احسن سے چلانے کے لئے قوانین وضح کرے تاہم ۱۸۳۳ء کے ایکٹ میں کونسل میں قانون دانوں کی تعیناتی سے تنظیمی امور کے ساتھ ساتھ قانون سازی کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ ۱۸۶۱ء کے ایکٹ کے تحت اختیارات ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج برطانیہ کو منتقل ہوئے۔ ۱۸۹۲ء کے ایکٹ کے مطابق کونسل کے کچھ ممبران کی تعیناتی کا طریقہ کار الیکشن کے ذریعے عمل میں لانے کا قانون پاس کیا گیا۔ ۱۹۰۴ء میں مارلے منٹو اصلاحات عمل میں آئیں جس نے صوبائی قانون ساز کونسل سے سرکاری ممبران کی تعداد ختم کر کے منتخب گروپس مثلاً جاگیردار، جامعات اور تجارتی تنظیموں کے ذریعے انتخاب کرایا نیز انڈین قانون ساز کونسل کی تعداد بڑھائی گئی۔(۷۸)

(۷۵) Indian Statory Commission, Vol I, Calcutta, Government of India Central Publication branch, 1930, Page 60-71

۱۸۵۷ء تک براعظم کا نظم ونسق ایسٹ انڈیا کمپنی چلاتی تھی۔ برطانوی حکومت کو بھی عمل دخل تھا لیکن کمپنی کی اہمیت زیادہ تھی۔ ۱۸۵۸ء میں خاص قانون کا نفاذ کیا گیا جس کی رو سے اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج برطانیہ کو منتقل ہو گیا۔ اس قانون کے تحت جملہ اختیارات برطانوی کابینہ کے وزیر ہند کے نام منتقل ہو گئے۔ اس کی مدد کے لیے پندرہ افراد پر مشتمل ایک کونسل کی تشکیل کی گئی جس میں آٹھ ارکان تاج برطانیہ کے نامزد کردہ تھے جب کہ سات ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کے نامزد کردہ تھے۔ تمام کی مدت رکنیت تاحیات تھی۔ دس پندرہ برس ایسٹ انڈیا کمپنی کی نمائندگی مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ اس قانون سے یہ فائدہ ہوا کہ کمپنی اور برطانوی تاج کی دو عملی پالیسی کا خاتمہ ہو گیا اور قانون کی حکومت قائم ہو گئی جو رعایا کے لیے قدرے

فائدہ مند تھی۔(۱۳۴)

۱۸۵۸ء میں ملکہ برطانیہ اور ہاؤس آف کامنز اور ہاؤس آف لارڈز وغیرہ کا اعلان یکم نومبر کو شائع کیا گیا تھا۔جس کی دفعہ ٦ میں درج ذیل الفاظ کے ساتھ ذکر کیے گئے تھے۔

''اور یہ بھی ہمارا حکم ہے کہ جہاں تک ممکن ہے ہماری سب رعیت کو کسی قوم اور مذہب کی ہو بلاتعرض و طرفداری کے ہماری ملازمت میں، ان عہدوں پر جن کو دے اپنی علمیت اور قابلیت اور دیانت سے انجام دے سکتے ہوں، مقرر کرتے ہیں''۔(۱۳۵)

ملکہ برطانیہ کے ۱۸۵۸ء کے اعلان کی دفعہ۴ میں درج ذیل الفاظ تھے۔

''جولوازم بہ نسبت اپنی دوسری رعایا کے ہم پر واجب ہیں وہی لوازم بہ نسبت اپنی رعایا ہند کے ہم اپنے ذمہ لازم بنائیں گے اور بفضل خدا وفاداری اور راستی کے ساتھ ہم لوازم مذکور کا لحاظ کرتے رہیں گے۔یعنی آسٹریلیا، کینیڈا، فیجی، ماریشس کیپ کالونی ساؤتھ، افریقہ، نیوزی لینڈ وغیرہ کے بسنے والی انگریزی رعایا اور ہندوستان کی بسنے والی رعایا کے حقوق برابر رکھے جائیں گے۔اور جو مراعات دوسروں کے ساتھ کی جائیں گی وہ ہندوستانیوں کے ساتھ بھی ضرور بالضرور کی جائیں گی''۔(۱۳٦)

یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو برطانوی ملکہ نے ایک خصوصی اعلان جاری کیا جس میں کہا گیا کہ اب کسی دیسی ریاست پر قبضہ نہیں کیا جائے گا اور ان ریاستوں کے حکمرانوں کا احترام ہوگا۔ان تمام ہندوستانیوں کے لیے عام معافی کا اعلان کیا گیا جو اس وقت حکومت برطانیہ کے ساتھ برسر پیکار تھے۔مذہبی اداروں کو یقین دہانی کرائی گئی اور یہ بھی کہا گیا کہ ملازمت کے لیے صرف تعلیمی قابلیت کو دیکھا جائے نسل یا عقیدے کا کوئی امتیاز نہیں ہوگا۔رعایا کو یقین دہانی کرائی گئی کہ ان کی مادی اور اخلاقی بہتری کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں گے۔اس اعلان کی وجہ سے لوگوں کو اطمینان ملا اور حالات درست ہوگئے۔(۱۳۷)

مجالس قانون ساز ۱۸٦۰ء

۱۸٦۰ء میں مجموعہ تعزیرات ہند مرتب ہونا شروع ہوگیا۔اس وقت سے قانون کے اندر ہم آہنگی پیدا ہونا شروع ہوگئی۔تعلیمی، مجلسی اور تمدنی اصلاحات کی جانب تھوڑی بہت توجہ دینا شروع کی گئیں۔تعلیمی اصلاح کی جانب اتنی توجہ دی گئی کہ انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور کلرکی کی خدمات کے لالچ کے ذریعے اہل ہندوستان کو انگریزی زبان سیکھنے کی طرف راغب کیا گیا۔☆

☆ عذرا وقار، تحریک پاکستان اور نوائے وقت، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص۴۵۱۔

مجالس قانون ساز ۱۸۶۱ء

گورنر جنرل کو حکومت چلانے کے لیے مشاورت کے لیے ۱۸۵۳ء میں چار اراکین پر مشتمل ایک ایگزیکٹو کونسل قائم تھا اور ایک قانون ساز کونسل قائم تھی جس کے اراکین کی تعداد بارہ تھی۔ ۱۸۶۱ء کے انڈین کونسلز ایکٹ میں چند تبدیلیاں کی گئیں جن کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں۔

۱۔ ایگزیکٹو کونسل کے اراکین میں ایک کا اضافہ کیا گیا۔ گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی غیر موجودگی میں کونسل کے اجلاس کے لیے کسی کو نامزد کر سکتا تھا۔ اسے ایگزیکٹو کونسل کو چلانے کے لیے قواعد وضوابط بنانے کا اختیار دیا گیا۔

۲۔ اس بات پر گورنر جنرل کو اختیار دیے کہ مختلف اراکین میں حکومت محکمے تقسیم کر دے۔ ہر رکن اپنی رپورٹ فولیو یا محکمے کے معمولی امور کا فیصلہ خود کرتا تھا اور اہم امور میں گورنر جنرل سے مشاورت کرتا تھا۔ جب کونسل کا اجلاس ہوتا تو اس میں مجموعی دلچسپی کے امور پیش ہوتے تھے یا ایسے مسائل جو محکموں کے درمیان اختلافات سے پیدا ہوتے تھے۔

۳۔ ۱۸۶۱ء کے قانون کے تحت گورنر جنرل کی قانون ساز کونسل کا دائرہ وسیع ہو گیا۔ اس کے اراکین کی تعداد میں چھ سے بارہ تک کا اضافہ کیا گیا اور اس کے ساتھ یہ شرط عائد کی گئی کہ اضافی ارکان میں کم از کم نصف ارکان غیر سرکاری ہوں گے۔ اس کونسل کے اختیارات بہت کم تھے۔ اس کے اراکین نہ سوال کر سکتے تھے۔ نہ ہی قراردادیں پیش کر سکتے تھے۔ نہ ایگزیکٹو کونسل کو کنٹرول کر سکتے تھے ان کا کام صرف قانون سازی میں مدد کرنا تھا۔

۴۔ اس قانون کے تحت صوبوں میں بھی قانون ساز کونسلیں قائم کی گئیں اور ان میں بھی غیر سرکاری اراکین کا کوٹہ مقرر کیا گیا۔ (۱۳۸)

سائمن کمیشن رپورٹ میں ہندوستانی کونسل ایکٹ ۱۸۶۱ء

سائمن کمیشن نے اپنی مرتب کردہ رپورٹ کے حصہ اول میں انڈین کونسل ایکٹ ۱۸۶۱ء کو بیان کرتے ہوئے کہا۔

قانون سازی کونسلوں کو ۱۸۶۱ء کے ایکٹ کے تحت چھوٹی پارلیمنٹ کے طور پر قائم کیا گیا تھا یا اس کے ذمہ داروں کی ذمہ داری کے نقطہ آغاز کے متعلق سوچنا ایک غلطی ہوگی۔ اِن کے کام کو یقیناً سختی سے قانون سازی کی حد تک محدود کر دیا گیا۔ جس پر عمل درآمد شروع ہوا تھا۔ واضح طور پر قانون سازی کے اقدامات پر غور اور نافذ کرنے کے بغیر کسی بھی کاروبار کو منتقل کرنے کے لئے منعقد کیا گیا تھا، یا کسی بھی تحریک کو پیش کرنے کے لئے کسی بل کو متعارف کرایا وہ بل کے اصل حوالے سے متعارف کرایا گیا۔ مونٹگو- چیمسفورڈ کی رپورٹ تک پہنچ گئی ہے۔ ان کونسلوں کے کردار لارڈ میکڈونل کے اقتباس سے لی گئی ایک اقتباس کو مختصر بیان کر دیا ہے جسے ہم یوں پیش کرتے ہیں:

''اس قانون سازی کے کرداروں کو ۱۸۶۱ کے ایکٹ کی طرف سے قائم، کہ وہ قوانین بنانے کے مقصد کے لئے کمیٹیاں ہیں جس کے ذریعے حکمران حکومت ان کے قانون سازی میں نصیحت حاصل کرتا ہے، اور عوامی طور پر مکمل اشاعت کے فائدہ پر یقینی بنایا جا رہا ہے (THO) قانون سازی کے عمل کے ہر مرحلے اگرچہ حکومت اپنی کونسل کے ذریعہ قوانین کو نافذ کرتی ہے، نجی قانون سازی کو نامعلوم نہیں، تاہم عوام کو خود شنید (سننے) کا حق ہے، اور انتظامیہ اس کے قوانین کا دفاع کرنے کی پابند ہے اور جب آپ نے قوانین ان کے لئے بناتے ہیں تو، ان کی طرف بالعموم ایگزیکٹو وان کی طرف سے عام طور پر پابند کیا جاتا ہے، اور ان کو نافذ کرنے کے لئے ان کی ذمہ داریاں عدالت کے مطابق ہیں۔ بعد میں، دو اہم طبقات کی رائے کے لئے ایک بڑھتا ہوا دفاع رہا ہے، یہاں تک کہ جب وہ حکومت کے نتائج کے ساتھ تنازعات کرتے ہیں، اور اس طرح کے نتیجے میں اکثر ان کی غیر رسمی اندرونی خواہشات کو پورا کرنے میں ترمیم کی جاتی ہے. ابھی تک یہ قانون سازی کونسلوں میں تشکیل دینے والے فوری قوانین کی وضاحت کرنے کے لئے غلط نہیں ہوگا جسے حقیقت میں حکومتی احکامات کو لیکن اس طرح کے قوانین کے مطابق آپ قانون سازی اور بحث کو یقینی بنا سکتے ہیں قانون کو عدالتوں کی طرف سے نافذ کیا جاتا ہے اور نہ کہ ایگزیکٹو کی طرف سے بلکہ اسی طرح سے جان بوجھ کر اور عوامی عمل کے ذریعہ وہ قانون کو نافذ یا تبدیل نہیں کر سکتے قانون اس کو نافذ کر سکتے ہیں۔ ایگزیکٹو کے خلاف یا افراد کے حق میں جب موقع کی ضرورت ہوتی ہے۔ کونسلز کسی مضامین کے بارے میں بطور خود کوئی طاقت نہیں، بلکہ سب سے پہلے فوری طور پر قانون سازی اور اس کی دشواریوں کو نوٹ کرنا اور معلومات کے لئے فوراً ایگزیکٹو کے طرزِ عمل کی جانچ پڑتال نہیں ہوسکتی مگر انتظامیہ کے کورٹ سے حذف کیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی اس طرح اسمبلیوں میں قانون کا دفاع بھی کیا جاسکتا ہے ماسوائے اس کے کہ کیا وہاں کسی پیمائش کے حوالے سے موضوع زیرِ بحث ہوں''۔(۱۷۴)

۱۸۸۵ء میں کانگریس کی تشکیل کے بعد ہندوستان میں سیاسی بیداری کا عمل تیز ہو گیا اور حقوق خود اختیاری کا

مطالبہ زور پکڑتا گیا۔ کانگریس نے اپنے پہلے ہی اجلاس میں ہندوستانی قانون ساز کونسلوں کے نقائص کو دور کرنے کا مطالبہ پیش کر دیا۔ اس کے علاوہ ان کونسلوں میں منتخب نمائندوں کی شمولیت پر زور دیا۔ عوامی مطالبے کے پیش نظر برطانوی حکومت نے ۱۸۶۱ء کے قانون ہند میں ترمیم کے ذریعے ۱۸۹۲ء میں اہل ہند کو دستوری اصلاحات کی ایک اور قسط دی۔ اس ترمیم کا مقصد یہ تھا کہ اہل ہندوستان بلواسطہ مجلس قانون ساز میں شامل ہو کر عوام کی نمائندگی کر سکیں۔ ہندوستانیوں کو پہلی دفعہ موقع فراہم کیا گیا جس کی بدولت وہ انتخابات میں حصہ لے کر مجلس قانون ساز میں اپنے ملک اور عوام کی نمائندگی کرنے کے قابل ہو سکے تھے۔ اس کے اہل ہند کو دو فائدے پہنچے، اول یہ کہ حکومت نے عوامی نمائندگی کا بنیادی اصول تسلیم کر لیا، دوسرا ملک میں سیاسی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد میں اضافہ ہو گیا۔ (۲۰)

انیسویں صدی کے آخر میں برطانوی ہندوستان میں خودمختار حکومت کے قیام کے جانب ایک اہم پیش رفت ہوئی۔ برٹش کونسلرز کو تعینات کیا گیا تا کہ وہ برٹش وائسرائے کو مشاورت پیش کریں اور صوبائی کونسل سے کسی تشکیل میں ارکان کے ساتھ کام کریں۔ ایک عمل کے ذریعے مقامی باشندوں کی لجسلیٹو کونسل میں شرکت کی راہ ۱۸۹۲ایکٹ کے ذریعے ہموار کرنے میں معاون ثابت ہوا۔ (۱)

۱۸۹۲ء کے انڈین کونسلز ایکٹ کے تحت بننے والی کونسلوں میں مسلمانوں کو ان نشستوں میں سے نصف حصہ بھی نہیں ملا تھا جن پر ان کا حق بلحاظ آبادی تھا۔ یہ سب کچھ مخلوط انتخابات کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس بات کا مداوا صرف اور صرف جداگانہ انتخابات کر سکتے تھے۔ مسلمانان ہند کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ اُن کے اس حق کو آئینی تحفظ میسر ہو۔ ۱۹۰۶ء میں چھتیس سرکردہ مسلمان لیڈروں کا وفد جن کا تعلق ہندوستان کے مختلف علاقوں سے تھا وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے شملہ میں ملاقات کی۔ شملہ اس وقت ہندوستان کا موسم گرما کا دارالخلافہ تھا۔ اس کی سربراہی سر آغا خان نے کی اور وائسرے کے سامنے مندرجہ ذیل مطالبات پیش کئے۔ مسلمانوں کو ان کی آبادی، سماجی حیثیت اور مقامی اثر و رسوخ کے حوالے سے بلدیاتی اور ضلعی سطح پر نمائندگی دی جائے۔ یونیورسٹیوں کی گورنگ باڈیز مسلمانوں کی نمائندگی کی یقین دہانی کرائی جائے۔

قائداعظم کا سیاسی فلسفہ عدم تشدد تھا جو ان کی سیاسی جدوجہد میں نظر آتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۱۳ء میں اس یقین دہانی کے تحت مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی کہ ان کی وفاداری کسی بھی صورت میں تقسیم نہیں ہوگی۔

قائداعظم ابھی تک کانگریس کے اہم رکن اور فرقہ وارانہ اتحاد کے علمبر دار تھے مسلم لیگ میں شمولیت کے صرف دو سال بعد وہ مسلم لیگ کے صدر بن گئے۔ ایسی جماعت کا صدر بننا یہ ظاہر کرتا تھا کہ لیگ ''معاف کردو اور بھول جاؤ'' کی روشن راہ پر سفر کر رہی تھی۔

بمبئی میں مسلم لیگ کے منعقدہ اجلاس میں اعتماد حاصل کرنے کے بعد قائداعظم پوری تندہی سے اپنے کام میں مگن ہو گئے۔ یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس میں آئینی اصلاحات کی ترتیب کے لیے کمیٹی کے قیام کی قرارداد پیش کی۔ اس کمیٹی کا کام دوسری سیاسی جماعتوں کے مشورے کے ساتھ آئینی اصلاحات کی ترتیب تھی جو کہ متحدہ ہندوستان کے نام پر متفقہ مطالبات کی بنیاد بن سکیں۔ یہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوئی اور اس کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگی رہنماؤں کی کمیٹی کی تشکیل ہوئی دوسری جانب کانگریس نے بھی ایک کمیٹی قائم کی اور موتی لعل نہرو اس کے سربراہ بنے۔ اس کمیٹی کا اجلاس اپریل ۱۹۱۶ء میں الہ آباد میں نہرو کی رہائش گاہ پر ہوا۔ اس اجلاس میں جو فیصلے ہوئے ان کی بنیاد پر قائداعظم نے وہ تاریخی دستاویز مرتب کی جس کو ''میثاق لکھنو'' کے نام سے شہرت ملی۔ دونوں گروپوں نے قیصر باغ لکھنو میں اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۶ دسمبر ۱۹۱۶ء میں اس کو باضابطہ منظور کیا اور لکھنو پیکٹ کے نام موسوم ہو گیا۔

جداگانہ انتخابات

۱۸۹۲ء کے انڈین کونسلز ایکٹ کے تحت بننے والی کونسلوں میں مسلمانوں کو ان نشستوں میں سے نصف حصہ بھی نہیں ملا تھا جن پر ان کا حق بلحاظ آبادی تھا۔ یہ سب کچھ مخلوط انتخابات کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس بات کا مداوا صرف اور صرف جداگانہ انتخابات کر سکتے تھے۔ مسلمانان ہند کی سب سے بڑی ضرورت یہ تھی کہ اُن کے اس حق کو آئینی تحفظ میسر ہو۔ اس وقت کے مسلمان زعماء کی کاوشوں کا بنیادی نقطہ یہی تھا وہ موقع کی مناسبت سے مسلمانوں کے الگ تشخص کو اجاگر کرتے اور اسی کو بنیاد بنا کر حکومت وقت سے مرعات لینے کی کوشش کرتے۔(۹)

سائمن کمیشن رپورٹ میں انڈین ایکٹ آف ۱۸۹۲ء

سائمن کمیشن نے اپنی مرتب کردہ رپورٹ جو کہ ۱۹۳۰ء میں چھپی تھی جس کے پہلے حصہ ہندوستان

کے سیاسی، معاشی و معاشرتی حالات کو بیان کیا گیا ہے جبکہ اس کے دوسرے حصہ میں آئینی تجاویز دی گئی ہیں اس رپورٹ کے حصہ اول میں سائمن کمیشن میں انڈین ایکٹ آف ۱۸۹۲ء کو یوں لکھا ہے۔

مرحلہ وار ۱۸۹۲ء میں پہنچ گئے۔ ہندوستانی کونسلز ایکٹ نے اس سال ایک محدود اور غیر مستقیم ذریعہ جو صوبائی کونسلوں اور ہندوستانی قانون سازی کونسل پر دونوں غیر سرکاری افسروں کے انتخاب میں شمولیت کے طریقہ کار کے استعمال کے لئے بنایا۔ گورنر جنرل کے دو لفظ ''انتخابی'' تاہم وہ کبھی بھی قانون میں استعمال نہیں ہوا تھا۔ اس عمل کو کچھ مخصوص اداروں کے دوبارہ کام کرنے پر نامزد کیا گیا تھا. بھارتی قانون ساز کونسل کے معاملے میں، پانچ مزید ''اضافی'' ممبران کا اضافہ یوں کیا گیا کہ ایک صوبائی کونسل میں سے ہر ایک کے غیر سرکاری اراکین اور ایک رکن کی کلکتہ چیمبر آف کامرس نے سفارش کی۔ صوبائی کونسلوں کے معاملے میں، غیر سرکاری نشستوں میونسپلٹیوں اور ضلع بورڈز کو سفارشات سے پر کیا گیا اور سفارشی کمیٹیاں جن کا زیادہ حصہ میونسپلٹیوں سے تھا اس طرح بلاواسطہ انتخابات کی ایک قسم کی ابتداء کی گئی۔ ایک ہی وقت میں کونسلوں کے افعال کو آمدنی اور اخراجات کے سالانہ تخمینہ کی بات چیت کی حد (اگرچہ ووٹنگ کا حق نہیں) کو بڑھایا گیا تھا، اور ارکان نے انہیں ایگزیکٹو کے سوالات سے خطاب کرنے کا حق دیا تھا. کونسلوں پر سرکاری اکثریت اور ابھی تک ایک پارلیمانی نظام کے پاس کوئی نقطہ نظر نہیں ہے. درحقیقت لارڈ ڈفرن، جس کے وقت میں تجاویز پہلے بھیجی گئیں جو ایک طرح سے ۱۸۹۲ء آئین بننے کا سبب بنیں اور اس سے نمٹنے سے انکار کرنے کے لئے محتاط تھا۔ اس نے لکھا

> ''ہماری منصوبہ بندی کو ہماری صوبائی کونسلوں کی توسیع کے لئے مختصر طور پر بیان کیا جاسکتا ہے، ان کی حیثیت میں اضافہ، ان کے افعال کی نگرانی، ان کے اختیاری تعارف اور سیاسی کردار کے طور پر ان کے عام کردار کا آزادانہ طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ہم تمام واقعات، جہاں تک صوبوں سے متعلق ہیں، انگریزی پارلیمانی حکومت اور انگریزی آئینی نظام کے بارے میں سوچ رہے تھے. اس طرح کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ بطور یادداشت بہت وسیع ہے۔ ہندوستانی آفس یا ہندوستانی عوام کو کسی بھی تاثر کے تحت چھوڑنے کے لئے غلط ہوگا. ہندوستان ایک لازمی حصہ ہے، اور اس نے طاقتور برتانوی سلطنت کے سب سے اہم حصے میں کہا ہے۔ ایک اجنبی نسل کی رہنمائی، جن کی فنکشن متضاد یا متضاد مفادات کے درمیان ثالثی ہے، اور اس کی حکومت اس کا نام ہے. ایک بادشاہ جس کی حکومت برطانیہ میں ہے۔ ایگزیکٹو جو ہندوستان میں اس کے سامراج کی نمائندگی کرتا ہے وہ کسی حکومتی اتھارٹی سے نہیں بلکہ خودمختار اور برطانوی پارلیمنٹ کو براہ راست ذمہ دار ہے۔ اس کے اراکین خود کو اس ذمہ داری کا تقاضا کر سکتے تھے۔ جب تک کہ برطانیہ میں ہندوستان میں اعلی انتظامی

طاقت موجو ہے. لیکن یہ آئینی حکومت کی بنیاد ہے کیونکہ انگریزی اصطلاح میں یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی انتظامیہ کومعاملات کی سربراہی میں نہیں رہنا چاہئے، جس کے مطابق کسی بھی اقدامات یا پالیسی کی ضرورت نہیں ہے، یہ عوامی مفاد کے لئے ہوسکتا ہے. اس طاقت کو، طاقتور یا پارلیمان کی طرف سے روک دیا جاتا ہے، ایک آئینی ایگزیکٹو نے اپنی افعال سے استعفی دے دیا ہے اوران لوگوں کو راستہ دیتا ہے جن کے ساتھ انتخابی حلقوں کے ساتھ اعلی اثرات نے ان کے فیصلے کو ختم کرنے کے قابل بنائے ہیں، اوراس کے نتیجے میں جو کچھ بھی طریقہ کار کے لیے جواب دیا جاتا ہے، کیا وہ اپنے پیشواؤں کی طرف سے سفارش کے تناظر میں اپنایا. ہندوستان میں یہ ایک قسم کی افراد کی ذمہ داریاں کسی دوسرے سے موجود ہے، حالانکہ موجودہ حالات میں ناممکن ہوسکتا ہے، کیونکہ اگر کسی بھی قانون سازی کونسل میں پیش کردہ کسی بھی پیمانے پر منفی اکثریت کی طرف سے مستحکم ہے تو گورنر متضادوں کو اپنی جگہ نہیں لے سکتا. سرکاری سیکرٹریوں، جو ملک کے سیکرٹری کے مشورہ پر ملکہ کی طرف سے نامزد کیا جاتا ہے''۔(۱۷۵)

اس کے نتیجے میں ایک بھارتی کونسل میں حزب اختلاف کا ووٹ بھاری ذمہ داری کے تحت نہیں دیا جائے گا جس میں آئینی ملک میں متفق اکثریت کا ووٹ ڈالتا ہے؛ جبکہ کسی بھی ذمہ دار ایگزیکٹو کو اس وقت تک حکومت کے سامنے پر لے جانے کی ضرورت نہیں ہے جب تک کہ کسی بھی اقدامات کا افتتاح نہ کریں جب تک وہ ریاست کی اچھی اور حفاظت کے لئے لازمی سمجھے. اس وجہ سے، واضح طور پر، اس اور بہت سے دوسری وجوہات کے لئے، کونسلوں کی لبرلائزیشن کی حد تک کوئی فرق نہیں ہوسکتا ہے، یہ ہر صوبائی حکومت کو اپنا فیصلہ خود کرے سوالات، اوراس کی اپنی مرضی کے کنٹرول اپنی پالیسی یہ اس نظریہ میں ہے کہ ہم نے یہ اہتمام کیا ہے کہ کونسل میں نامزد کردہ اراکین کو منتخب کردہ اراکین سے گزرنا چاہئے، اس وقت جب گورنر جنرل موجودہ کونسل کو ختم کرنے کے لئے طاقتور بنائے جب بھی وہ اپنے آپکو حالات کے تقاضے کے نام پر بلایا جانا سمجھے۔ (۱۷۶)

۱۹۰۶ء میں چھتیس سرکردہ مسلمان لیڈروں کا وفد جن کا تعلق ہندوستان کے مختلف علاقوں سے تھا وائسرائے ہند لارڈ منٹو سے شملہ میں ملاقات کی۔ شملہ اس وقت ہندوستان کا موسم گرما کا دارالخلافہ تھا۔ اس کی سربراہی سرآغا خان نے کی اور وائسرے کے سامنے مندرجہ ذیل مطالبات پیش کئے۔ مسلمانوں کو ان کی آبادی، سماجی حیثیت اور مقامی اثر ورسوخ کے حوالے سے بلدیاتی اور ضلعی سطح پر نمائندگی دی جائے۔
یونیورسٹیوں کی گورنگ باڈیز مسلمانوں کی نمائندگی کی یقین دہانی کرائی جائے۔
مسلمانوں کو صوبائی کونسلوں میں ایسے انتخابات کی بدولت نمائندگی دی جائے جس میں حلقہ نیابت

مسلمان، زمینداروں، وکیلوں تاجروں اور دیگر اہم مفادات کے حامل گروہوں یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ افراد اور ضلعی و بلدیاتی اداروں کے اراکین شامل ہوں۔

شاہی قانون ساز کونسلوں میں مسلمانوں کے نمائندوں کی تعداد کا انحصار صرف مسلمانوں کی آبادی پر نہ ہو اور نہ ہی بے اثر اقلیت کے طور پر ہو جس حد تک ممکن ہو ان کا انتخاب نامزدگی کے برعکس مسلمانوں کے خاص حلقہ ہائے نیابت کے ذریعہ کیا جائے جن کے رائے دہندگان، زمینداروں، وکیلوں، تاجروں صوبائی کونسلوں کے ممبروں اور یونیورسٹیوں کے اراکین پر مشتمل ہوں۔

وفد نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمان (ہندوستان) قوم کے اندر ایک علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں ان کے حقوق کے لیے آئینی تحفظ چاہیے۔ وفد کی رائے کے مطابق ہندوستان کے معاملے میں اس مسئلے کا حل اس صورت میں ہے کہ مسلم اقلیت کو تمام منتخب اداروں میں فرقہ وارانہ نیابت کی وجہ سے علیحدہ نمائندگی دی جائے وفد نے وائسرائے کو جو یادداشت پیش کی اس میں محتاط الفاظ میں تنبیہ بھی شامل تھی کہ

> ''حالیہ واقعات نے جذبات کو برانگیختہ کیا ہے خاص طور پر مسلمانوں کی نوجوان نسل بہت برہم ہے ایسے لگتا ہے کہ بعض معاملات میں یہ لوگ اعتدال پسندانہ مشورے اور سنجیدہ راہنمائی سے بغاوت کر دیں''۔(۱۰)

محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن کا قیام:

سرسید نے ہندوستان کے سیاسی صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد مسلمانوں کو اپنا نقطہ نظر بدلنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اب اس بات کو محسوس کرنے لگے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کو تحفظ دینے کے لیے ان کی علیحدہ جماعت بننی چاہیے۔ یہ احساس دن بدن بڑھتا گیا۔ اس ضمن میں پہلا قدم خود سرسید نے ۱۸۹۳ء میں محمڈن اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن کا آغاز کر کے کیا۔ اس ایسوسی ایشن کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تحفظ اور ایک فورم پیدا کرنا تھا جہاں مسلمان اپنے مسائل پر بحث کر سکیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں زیر بحث آنے والے موضوعات کا سلسلہ بدلتا چلا گیا اور اس کے اجلاس میں تعلیمی امور کے ساتھ ساتھ سیاسی امور بھی زیر بحث آنے لگے۔(۱۸۵)

۱۹۰۱ء میں کچھ مسلمانوں نے اس ایسوسی ایشن کو فعال بنانے کی تجویز پیش کی۔ ۱۹۰۲ء میں یوپی کے جلسہ میں اس کے قیام کا اعلان ہوا۔ اس ایسوسی ایشن کے قیام سے پہلے مسلمان قائدین کو اپنے علیحدہ ہونے کا احساس ہو گیا۔ سرسید نے اپنی وفات کے چند برس پہلے جو کچھ فرمایا وہ درست ثابت ہوا۔ آپ نے اپنی تقریر

میں فرمایا:

''سب سے اہم سیاسی سوال یہ ہے کہ انتظامیہ کون چلائے گا اور ملک پر کون حکومت کرے گا۔ فرض کریں کہ تمام انگریز اور ان کی فوجیں ہندوستان چھوڑ دیں۔ اور اپنی آرٹلری اسلحہ اور بارود جہازوں میں بھر کر لے جائیں تب ہندوستان پر کون حکومت کرے گا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کہ ان حالات میں دو قومیں ہندو اور مسلمان ایک تخت اقتدار پر بیٹھیں اور کیا وہ طاقت کے لحاظ سے مساوی ہیں؟ بالکل نہیں یہ ضروری ہے کہ ان میں سے ایک قوم دوسروں کو فتح کر کے اپنا ماتحت بنائے۔ یہ امید کرنا کہ یہ دونوں مساوی رہیں ناممکن اور ناقابل فہم ہے۔ یہاں یہ جان لینی چاہئے کہ اگر ہندوستان میں مسلمان ہندوں سے عددی لحاظ سے کم ہیں انہیں ہتک آمیز نگاہوں سے نہیں دیکھنا چاہئے اور کمزور بھی نہیں سمجھنا چاہئے وہ اتنے وافر ضرور ہیں کہ اپنا تحفظ کر سکیں''۔(۱۸۶)

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام:

محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کا نصب العین بعد ازاں مسلم لیگ کا مرکز فکر بن گیا۔ چنانچہ مسلم لیگ کے قیام کے بعد اس کے سب سے پہلے سیکرٹری نے مسلم لیگ کی پالیسی کی تشریح ان الفاظ میں کی۔

''ہماری تعداد بمقابلہ دوسری قوموں کے ہندوستان میں ایک خمس ہے اب اگر کسی وقت ہندوستان میں ''خدانخواستہ'' حکومت نہ رہے تو ہمیں ہندوؤں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے گا اور ہماری جان، ہمارا مال، ہماری آبرو، ہمارا مذہب سب خطرہ میں ہوگا۔ اگر کوئی تدبر ان خطروں سے محفوظ رہنے کی ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے تو وہ یہی ہے کہ انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم رہے۔ ہمارے حقوق کی حفاظت تب ہو سکتی ہے جب کہ ہم گورنمنٹ کی حفاظت پر کمر بستہ رہیں اور ہمارا وجود اور گورنمنٹ کا وجود لازم وملزوم ہیں۔۔۔۔انگریزوں کے بغیر ہم عزت وآسودگی کے ساتھ نہیں رہ سکتے''۔(۱۸۷)

۱۹۰۵ء میں ہندوستان کے اندر وائسرائے کی تبدیلی ہوئی، لارڈ کرزن کی جگہ لارڈ منٹو نے ہندوستان کے وائسرائے کا عہدہ سنبھال لیا۔ جب کہ برطانیہ میں لبرل پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ کانگریس نے مزید نئی دستوری اصلاحات کے لئے مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ جس کی بنا پر نئی دستوری اصلاحات کے نفاذ کا امکان پیدا ہو گیا۔ اس ضمن میں لارڈ منٹو اور جان مورلے (سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان) نے بھی بعض اعلانات کئے تھے۔ اس صورتحال کے پیش نظر سرسید کے حامیوں محسن الملک اور وقار الملک کو اس بات کی تشویش پیدا ہو گئی کہ اگر ہندوستان میں انتخابات کا اصول رائج کر دیا گیا تو ہندو اکثریت کی بنا پر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ سیاسی لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندو اکثریت کے مقابلے میں مسلم قائدین نے مدافعانہ

رویہ اختیار رکھا۔ ان کے نزدیک مسلمان جو کہ اقلیت میں ہیں ان کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے کہ انتخابات کا انعقاد جداگانہ نیابت کی بنیاد پر کیا جائے۔ اسی سلسلہ کے لئے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو سر آغا خان کی قیادت میں مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد نے لارڈ منٹو سے شملہ میں ملاقات کی جس نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ان کے حقوق کا تحفظ ان کے مطالبات کی روشنی میں کیا جائے گا۔ اس وفد کی کامیابی نے مسلمانوں کو ان کے لیے سیاسی تنظیم بنانے کی راہ ہموار کردی۔ دسمبر ۱۹۰۶ء میں مسلم قائدین کا ڈھاکہ میں اجتماع ہوا اور آغا خان کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ معرض وجود میں آگئی۔ وقارالملک کو سیکرٹری مقرر کیا گیا جب کہ محسن الملک جوائنٹ سیکرٹری مقرر کیئے گئے۔ مارلے منٹو آئینی اصلاحات کے نفاذ کو ہندوستان میں انڈین کونسل ایکٹ ۱۹۰۹ء کے ذریعے کیا گیا جس کی بدولت مسلمانوں کا مطالبہ جداگانہ حق نیابت اصولی اور آئینی طور پر تسلیم کرلیا گیا تھا۔(۱۸۸)

شملہ وفد نے وائسرائے سے ملاقات کے بعد تسلی بخش جواب لے لیا تو وفد کے اراکین نے آپس میں اصلاح مشورہ کے بعد فیصلہ کیا کہ دسمبر ۱۹۰۶ئمیں جب ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوتو اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک سیاسی اجتماع کیا جائے اور مسلمانوں کے لیے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد ڈال دی جائے۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو سیاسی اجتماع سے نواب وقارالملک نے خطاب میں فرمایا:

> ''ہندوستان کی دوسری قوموں کی آبادی کا صرف ایک چوتھائی مسلمان ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر کسی وقت ہندوستان میں برطانوی حکومت کا وجود باقی نہ رہے تو وہی قوم ہم پر حکومت کرے گی جس کی آبادی ہماری آبادی سے چار گنا ہے۔ اب حضرات! آپ سب کو سوچنا چاہیے کہ اس وقت ہماری حالت کیا ہوگئی؟ ایسی صورت میں ہماری جانیں، ہماری املاک ہماری عزت، ہمارا مذہب سب کچھ خطرے میں ہوگا۔ آج جب حکومت برطانیہ کی قوت سب کی حفاظت کی ضامن ہے تو اس کے باوجود مختلف صوبوں میں ہمیں اپنے ہمسایوں کے ہاتھوں طرح طرح کی مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا وقت آجائے کہ ہم ان لوگوں کے غلام بن جائیں جو سینکڑوں سالوں کے بعد اورنگزیب کا انتقام ہم سے لینا چاہتے ہیں۔ بے شک ہمارا یہ فرض ہے کہ اپنے دوستوں کو غلط راستے پر چلنے سے روکیں۔ ان سے پڑوسیوں کی کی حیثیت سے عمدہ سلوک کریں۔ معاشرتی سطح پر ان سے ہمدردی کا مظاہرہ کریں اور اپنے حقوق اور مفادات کی حفاظت کرتے ہوئے ان کے بارے میں کوئی ماندانہ طرز عمل اختیار نہ کریں''۔(۱۸۹)

سائمن کمیشن نے اپنی مرتب کردہ رپورٹ کے حصہ اول میں جس میں ہندوستان کے سیاسی، معاشی و معاشرتی حالات کو بیان کیا گیا ہے اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی آبادی کا ذکر کچھ اس طریقے سے کیا گیا

ہے۔

ہندوستان میں ہندوؤں کی آبادی ۱۶۳ ملین جبکہ کہ مسلمانوں کی آباد ۵۹.۵ ملین ہے۔ بنگال، پنجاب، NWFP، بلوچستان، کشمیر اور حیدر آباد کے صوبوں اور ریاستوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں جبکہ دیگر ریاستوں اور صوبوں میں ان کی تعداد تیس فیصد سے بھی کم ہے۔(☆)

(۱۷۷) Indian Statory Commission, Vol I, Calcutta, Government of India Central Publication branch, 1930, Page 28.

مسلم لیگ کی عارضی تشکیل:

نواب سلیم اللہ آف ڈھاکہ نے درج ذیل قرارداد پیش کی: ''ہندوستان کے تمام حصوں سے آئے ہوئے مسلمانوں پر مشتمل ڈھاکہ میں منعقدہ یہ اجلاس فیصلہ کرتا ہے کہ مندرجہ ذیل مقاصد کو آگے بڑھانے کے لیے آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ایک سیاسی جماعت بنائی جائے گی۔

۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کے احتجاج اور شملہ وفد ۱۹۰۶ء کے مسلمانان ہند کے زعماء نے ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سنگ بنیاد رکھا۔ پنجاب کے ممتاز رہنما سر محمد شفیع کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے'' آل انڈیا مسلم لیگ'' نام رکھا گیا۔☆

☆ ظہور احمد چوہدری، پنجاب میں برادریوں کی سیاست'' قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، ص ۲۹۸۔

تعلیم کے حصول کے بعد تعلیم یافتہ مسلمانانِ ہند نے قدرتی طور پر اسی راستے کا انتخاب کرنا تھا جس پر اس سے پہلے ہندو گامزن تھے۔ تاہم اقتصادی، تعلیمی اور سیاسی پسماندگی کی وجہ سے ان کو جداگانہ انتخاب اور مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے میونسپل کمیٹیوں کونسلوں اور ملازمتوں کی تخصیص کے لیے رجوع کیا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ انہی مطالبات کے پیشِ نظر معرضِ وجود میں آئی۔☆

☆ عذرا وقار، ص ۷

الف: مسلمانانِ ہند میں برطانوی حکومت سے وفاداری کے احساس کو فروغ دینا اور حکومت کے بارے میں ایسی غلط فہمیاں دور کرنا جو اس کے اقدامات کے متعلق پیدا ہوں۔

ب: مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق او مفادات کی پیش رفت اور ادب کے ساتھ ان کی ضروریات اور آرزاں کو حکومت تک پہنچانا۔

ج: لیگ کے مندرجہ بالا مقاصد کو متاثر کیے بغیر دوسرے فرقوں کی جانب مسلمانوں کی مخالفانہ احساسات کی روک تھام اس قرارداد کے حق میں حکیم اجمل خان مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی نے تقاریر کیں نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کو مشتری منتخب کیا گیا اور ساٹھ اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی اس کام کے لیے بنائی گئی کہ وہ اس کے آئین کے لیے تجاویز دے۔(۱۹۰)

دسمبر ۱۹۰۷ء میں مسلم لیگ کا پہلا باضابطہ اجلاس کراچی میں ہوا، جس کی صدارت آدم جی پیر بھائی نے کی جو کہ بمبئی کے ایک مشہور اور مخیرّ بزرگ تھے اس میں آئینی کمیٹی کی سفارشات پر غور رہوا اور باقاعدہ آئین بن گیا جس میں ہتک کے مقاصد میں ترمیم کے بعد یہ شکل دی گئی۔

الف: مسلمانانِ ہند کے اندر حکومت برطانیہ وفاداری کے احساس کو ابھارنا اور حکومت کی نیت سے متعلق ایسی غلط فہمیاں دور کرنا جو اس کے اقدامات سے متعلق ہوں۔

ب: مسلمانانِ ہند کے سیاسی اور دوسرے حقوق کی حفاظت اور ان کی ضروریات اور خواہشات معتدل طریقے سے حکومت تک پہنچانا دوسرے فرقوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کو فروغ دینا۔

آئین کے بنیادی خدوخال یہ تھے:

۱۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے اراکین کی تعداد ایک سو سے زائد نہیں ہوگئی۔ اراکین کی پہلی فہرست میں ایک تو شملہ وفد کے تمام اراکین شامل ہوں گے۔ دوسرے ان صوبائی کمیٹیوں کے اراکین جو کہ ڈھاکہ کے مطابق لیے جائیں گے اور ان کی رکنیت پانچ سال کے لیے ہوگی۔

۲۔ چالیس اراکین پر مشتمل ایک ایسی عاملہ بنائی جائے گی جنہیں تین سال کے لیے صوبائی کوٹہ کے تحت آل انڈیا مسلم لیگ کی اراکین منتخب کریں گے۔

۳۔ لیگ کے عہدار اس طرح ہوں گے صدر، چھ نائب صدر، ایک سیکرٹری، دو جائنٹ سیکرٹری تمام عہدہ داران تین سال کے لیے ہوں گے آئین کی منظوری کے بعد اجلاس ملتوی ہوا تین ماہ بعد دوسرا اجلاس علی گڑھ میں ہوا جہاں ایک تو اراکین کی فہرست مکمل کی گئی دوسرا مجلس عاملہ کا انتخاب عمل میں لیا گیا، تیسرا عہدہ داروں کے چناؤ ہوا۔ میزبانی پرنس آغا خان صدر منتخب کیے گئے اور سید حسن بلگرامی سیکرٹری نیز اس کمیٹی کو مسلم لیگ کی لندن شاخ بھی تسلیم کیا گیا جو سید امیر علی نے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے بنائی تھی اس طرح آل انڈیا مسلم لیگ کا تنظیمی ڈھانچہ مکمل ہوا۔(۱۹۱)

سر پرسیول گرفتھس نے مسلم لیگ کے قیام کے واقعہ کی اہمیت پر بڑا معنی خیز تبصرہ کیا ہے ان کے مطابق:

''مسلم لیگ کی تشکیل کے اور بھی اثرات ہوں گے لیکن اس نے مسلمانوں کے اس یقین پر مہر ثبت کر دی کہ ان کے مفادات ہندوؤں کے مفادات سے بالکل الگ پر کھے جانے چاہئیں اور ان کا یعنی (ہندوؤں اور مسلمانوں کا) ایک قوم میں ضم ہونا خارج از امکان بات تھی'' (۱۶)

(۱۶) ڈاکٹر محمد عارف، تحریک پاکستان پروگریسو پبلشرز لاہور اگست ۱۹۹۴ء، ص ۸۶، ص ۸۷

مسلم لیگ کی لندن میں شاخ اور اقبال:

۱۹۰۸ء میں مسلم لیگ کی ایک شاخ لندن میں بنائی گئی جس کے بانی اور پہلے صدر سید امیر علی تھے۔ انہوں نے نے اختتامی اجلاس سے خطاب کے دوران کہا کہ پچھلے چالیس برس سے میرا موقف یہ تھا کہ متحدہ ہندوستان ہماری ترقی کا واحد ذریعہ ہے لیکن مسلمانوں کے لیے یہ ممکنات میں سے نہیں ہے کہ وہ اپنے فرقہ وارانہ وجود کو کسی قومیت میں جذب کر دیں یا اپنے مقاصد کے لیے ایسی جماعت کے لیے کام کریں جو ان کی اپنی نہ ہو۔ مذہب اور اخلاقی معیار کا واضح فرق اس بات کو نا قابل عمل قرار دینا ہے کہ ہندوستان کے مختلف نسلوں اور قوموں کو ایک دوسرے میں شامل کر دیا جائے اس سے سید امیر علی کا موقف یہ تھا کہ وہ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کی صورت میں قائل تھے۔ لندن شاخ کے مقاصد بھی آل انڈیا مسلم لیگ کے مقاصد تھے یعنی برطانوی حکومت سے وفاداری مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور دوسری اقوام کے ساتھ دوستانہ تعلقات کا فروغ اور اس میں ایک مقصد کا اضافہ کیا گیا کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کے نقطہ نظر کو برطانیہ کے اہل فکر تک پہنچایا جائے اس کی وجہ یہ تھی کہ اصل اقتدار حکومت ہند کے پاس نہیں تھا، تاج برطانیہ کے پاس تھا اور حکومت ہند کو متاثر کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اقتدار کے ہر چشمہ اول یا اعلیٰ تک رابطہ پیدا کیا جائے۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے لندن کی شاخ کا الحاق منظور کیا اس کی وجہ سے اسے مالی امداد بھی بھیجی تا کہ وہ مسلمانوں کے موقف کی تائید میں برطانوی راہ عامہ کو ہموار کیا جا سکے۔ (۱۹۲)

اس زمانے میں رائٹ آنرایبل سید امیر علی کی زیر صدارت مسلمانان ہند کے سیاسی حقوق کی حفاظت کی خاطر لندن میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کا نام برٹش کمیٹی آف آل انڈیا مسلم لیگ رکھا گیا۔ ۱۹۰۹ء میں اس کمیٹی نے اپنا وفد لارڈ مارلے وزیر ہند کے پاس بھیجا اس وفد نے جداگانہ انتخابات اور مسلم نشستوں کے تعین پر

زور دیا۔(١٩٣)

جداگانہ انتخابات، مسلمان اور مسلم لیگ:

اس وقت لارڈ مارلے (Lard Morley) سیکٹری آف سٹیٹ برائے ہند تھے۔ انہوں نے میزانیہ (Budget) پر تقریر کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ برطانوی حکومت ہندوستانیوں کو دستوری اصلاحات کی ایک اور قسط دینے کی خواہاں ہے۔ اس کی بدولت موجودہ مجالس مقنّنہ وسعت اختیار کرے گی اور انتخابات کے اصول کو بھی مزید وسعت مل جائے گی۔ لارڈ مارلے کا یہ بیان جب نواب محسن الملک نے اخبار میں دیکھا تو اس وقت بمبئی میں مقیم تھے۔ موصوف نے وہاں سے ۴ اگست ١٩٠٦ء کو خط میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر ڈبلیو۔ اے۔ جے آرچ بولڈ ((W.A.J Archbold کو جو شملہ میں گرمیوں کی تعطیلات گزر رہے تھے لکھا: نواب صاحب نے خط کو اس طرح تحریر کیا کہ: ’’آپ وائسرائے ہند سے مسلمانوں کے ایک وفد کی ملاقات کے وقت کا تعین کر لیجئے تا کہ ملک کو ملنے والی نئی اصلاحات میں مسلمانان ہند بھی اپنے حقوق اور مناسب حصے کا مطالبہ پیش کر سکیں اور اس طرح سے مستقبل میں اپنے سیاسی حقوق کی نگہداشت اور نگرانی کر سکیں‘‘۔(١٩٦)

اس کام کے لیے نواب محسن الملک نے وائسرائے ہند کے پرائیوٹ سیکرٹری مسٹر ڈان لوپ اسمتھ (Dunlop Smith) سے بھی خط وکتاب کے ذریعے رابطہ قائم کیا جس کے نتیجے میں لارڈ منٹو نے نواب صاحب کے مجوزہ وفد کو ملاقات کا وقت دے دیا۔ وائسرائے سے وفد کے ساتھ ملاقات کے لیے نواب صاحب کو سب سے اہم مسئلہ مناسب افراد کے انتخاب کا تھا۔ اس کام کے لیے موصوف نے ہندوستانی زعما اور اکابرین و عمائدین کو وفد میں شرکت کرنے کے لیے مدعو کیا جب کہ دوسری جانب وفد کے ساتھ لے جانے کے لیے ایک عرضداشت تیار کی۔ اس عرض داشت تیار کرنے میں نواب عماد الملک اور سید حسین بلگرامی نے بھرپور ساتھ دیا۔ نواب صاحب نے اس عرض داشت کی ١٦ ستمبر ١٩٠٦ کو لکھنو کے ایک جلسہ عام میں اس کی منظوری دی۔ نیز انہوں نے اس عرضداشت کے سلسلے میں مختلف جماعتوں اور انجمنوں سے بھی مشاورت کی تا کہ ہر طبقہ کے تائید حاصل کی جا سکے۔(١٩٧)

مسلمانانِ ہند کا یہ سب سے پہلا سیاسی وفد تھا جس نے وائسرائے ہند سے ملاقات کی۔ اس وفد نے ملک کے ہر حصہ اور ہر طبقہ کے زعما اور قائدین شامل تھے۔ اس کی قیادت سر سلطان محمد شاہ، آغا خان سوم نے

کی۔اس وفد میں شامل زعماء کی تعداد پینتیس تھی۔اس وفد نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو شملہ میں وائسرائے سے ملاقات کی مذکورہ وفد نے وائسرائے کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ ہندوستان میں موجود قانونی نمائندگی کے تحت مسلمانوں کا حصہ لوکل سیلف گورنمنٹ اور مقنّنہ میں خاطر خواہ نہیں۔لہٰذا ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہندوستان آئندہ ملنے والی دستوری اصلاحات میں بحیثیت مسلم قوم جداگانہ قوم کی نیابت کی بنیاد پر مقنّنہ اور مقامی اداروں میں اس کے جائز حصے سے محروم نہ رکھا جائے۔(۱۹۸)

وائسرائے ہند نے وفد کو یقین اور اطمینان دلایا کہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو الگ نمائندگی دی جائے، میں اس سلسلے میں اپنی حکومت سے بھی سفارش کروں گا کہ وہ آپ کے مطالبات کو آپ کی خواہشات کے مطابق حل کرے۔وائسرائے نے مزید کہا کہ اقلیتوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے کچھ زیادہ نشستیں ملنی چاہئیں تاکہ پاسنگ کا یہ اصول تسلیم کرلیا جائے۔وائسرائے ہند سے حوصلہ افزا ملاقات کے بعد یہ ضروری ہوگیا کہ اب ان مطالبات کو تسلیم کرایا جائے اور مستقبل میں سیاسی وسماجی حقوق کے تحفظ کے لیے مسلمانان ہند کی الگ سیاسی جماعت بنائی جائے۔مسلمانوں کی طرف سے ڈھاکہ کی دعوت میں پوری ہوتی ہے۔اس مسئلے پر نواب محسن الملک نواب وقار الملک اور دیگر زعماء نے جدوجہد کی۔مسلمانان ہند نے اپنے لیے ایک علیحدہ سیاسی جماعت بنام ''آل انڈیا مسلم لیگ'' ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو قائم کی۔(۱۹۹)

جداگانہ انتخابات اور مسلمان:

یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو ہندوستان کے مسلم رہنماؤں کے وفد نے سر آغا خان کی قیادت میں وائسرائے لارڈ منٹو سے گرمائی دارالحکومت شملہ میں ملاقات کی اور اپنے درج ذیل مطالبات پیش کیے۔

۱۔ انتخابی اداروں کا انتخابی نظام ایسا ہونا چاہئے جس کی بدولت مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ خصوصی حلقوں سے اپنے نمائندوں کا انتخاب کرسکیں۔ باالفاظ دیگر مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کا حق مانگا جس کا مطلب یہی تھا کہ مسلمان نشستوں کے حلقے مخصوص ہوجائیں جہاں سے مسلمان کھڑے ہوں اور مسلمان اپنی ووٹ دے سکیں۔

۲۔ مسلمانوں کی تاریخ اور سیاسی پوزیشن کو مدنظر رکھتے ہوئے انہیں بلحاظ آبادی نشستیں دب جائیں جسے اصطلاحاً انگریزی Weightage اور اردو میں پاسنگ کہا جاتا ہے۔

۳۔ مسلمانوں کو ایک خاص تناسب سے گزٹیڈ اور نان گزٹیڈ ملازمتیں دی جائیں انہیں عدالت ہائے عدلیہ

میں جج مقرر کیا جائے اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں نمائندگی دی جائے۔

۴۔ یونیورسٹیوں کے سنڈیکٹ اور سینٹ موجود ہیں ان میں مسلمانوں کی نشستیں مختص کی جائیں۔

۵۔ علی گڑھ کالج کو مسلم یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لیے حکومت امداد دے۔(۲۰۰)

لارڈ منٹو نے عرضداشت کے جواب میں جو کچھ کہا اس کا اقتباس مندرجہ ذیل ہیں۔

''مجھے آپ لوگوں کی طرح اس بات کا پختہ یقین ہے کہ اگر ہندوستان میں انتخابی نمائندگی کا مقصد یہ ہو کہ اس براعظم میں آباد مختلف فرقوں کے عقائد اور روایات کا خیال کئے بغیر انفرادی حق رائے دہندگی دے دیا جائے تو اس کی ناکامی ناگزیر ہوگی''(۲۰۱)

''ہندوستان کی وسیع آبادی نمائندہ اردو کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتا اور مسلمان قوم مطمئن رہے کہ ایک فرقے کی حیثیت سے نظم ونسق کی ایسی تنظیم ہو تو میں ان کے سیاسی حقوق اور مفادات کے حفاظت کی جائے گی جس سے میرا تعلق ہوگا۔لارڈ منٹو نے جس طرح ہمدردانہ جواب دیا اس کی سب سے بڑی اہمیت نیا حق تھا جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی تھی اس کی بدولت دوقومی نظریے کو قانونی حیثیت حاصل ہوگی کہ انگریزی حکومت کے سربراہ نے تسلیم کرلیا کہ ہندوستان میں دوقومیں موجود ہیں۔یہی نہیں لارڈ منٹو نے اپنے جواب میں ہندوستان کو براعظم بھی قرار دیا۔دوقومی نظریہ کا پہلا مرحلہ جداگانہ انتخابات اور دوسرا دوقومی نظریہ یعنی تحریک پاکستان جداگانہ انتخاب ہے بعدازاں براعظم کی اسلامی ریاست کو بنیادی نکتہ بن گیا اور جو مطالبات بعد میں کیے گئے ان کا تعلق اس بنیادی نکتہ سے تھا۔(۲۰۲)

اگست ۱۹۰۶ء میں لبرل سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا نے اپنی بجٹ تقریر میں اشارہ دیا تھا کہ بہت جلد کونسلز کے انتظامات کے لیے اصلاحات کے نفاذ کا اعلان ہوگا۔لارڈ مارلے کے اس اعلان نے مسلمان کو ایک حد تک خوفزدہ کر دیا تھا کہ اگر کونسلز کے اختیارات میں توسیع ہوئی تو مسلمانان ہند کے حقوق محفوظ نہیں رہیں گے اور اکثریت والے نمائندے اقلیت کے حقوق کو متاثر کریں گے اس صورتحال کے پیش نظر کئی مسلمان رہنماؤں مہدی علی خان المعروف نواب محسن الملک جو ان دنوں ایم اے او کالج علی گڑھ میں سیکرٹری کے طور پر فرائض سرانجام دے رہے تھے طے ہوا کہ مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد اپنے حقوق اور مطالبات اور دیگر امور کے لیے وائسرائے ہند سے ملاقات کرے۔اس بات پر بھی اتفاق ہوا کہ اصلاحاتی ایکٹ کے حوالے سے وائسرائے سے پوچھا جائے گا کہ آپ نے متوقع تبدیلیوں اور اختیارات میں انتخابات کے حوالے سے مسلمانوں کے موقف کو سامنے رکھا جارہا ہے یا نہیں۔آخرکار نواب محسن الملک نے وائسرائے ہند سے ملاقات کے لیے وفد کی اجازت حاصل کر لی۔یہ بھی گمان ہے کہ شاید مسلمانوں کے وفد کی وائسرے سے ملاقات کے

لیے کچھ انگریزوں مثلاً آرچ بولڈ پرنسپل ایم اے او کالج علی گڑھ ڈنلیٹ سمتھ نے اس وفد کے وائسرائے تک رسائی میں مدد دی۔(۲۰۳)

بحر کیف نواب محسن الملک نے مسلمان رہنماؤں کے ساتھ مل کر یہ فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کے اتحاد اور حقوق کی حفاظت کے لیے انتظام ہونا چاہیے اس مقصد کے لیے ۱۹۰۶ء میں لکھنو میں ایک خصوصی اجلاس میں وفد کی جانب سے وائسرائے کو پیش کی جانے والی یادداشت کا مسودہ تیار ہوا اور پھر یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مسلمان رہنماؤں کا یہ وفد آغا خان کی صدارت میں شملہ پہنچا۔ اس تاریخی شملہ وفد کے اراکین کی تعداد پینتیس تھی۔

اس وفد کے ممبران کے قائد ہز ہائی نیس پرنس آغا خان تھے اس کے علاوہ باقی چونتیس ممبران میں ہندوستان بھر سے مندرجہ ذیل رہنماؤں نے شمولیت کی تھی۔

(۱) ہز ہائی نیس آغا خان (قائد) (۲) شہزاد بختیار شاہ (کلکتہ) (۳) ملک عمر حیات خان ٹوانہ ضلع شاہ پور (۴) خان بہادر محمد شاہ دین لاہور (۵) خان بہادر سید نواب علی چوہدری میمن سنگھ (۶) نواب بہادر مرزا شجاعت علی بیگ، مرشد آباد کلکتہ (۷) نواب ناصر حسین شاہ (۸) بہار خان بہادر سید امیر حسن خان، کلکتہ (۹) سید محمد امام پٹنہ (۱۰) نواب سرفراز حسن خان بہار پٹنہ بہار (۱۱) خان بہار احمد محی الدین، مدراس، (۱۲) مولوی رفیع الدین احمد، بمبئی (۱۳) ابراہیم بھائی آدم جی پیر بھائی، بمبئی، (۱۴) مولوی عبدالرحیم صاحب، کلکتہ (۱۵) سید آسر داد شاہ، خیر پور سندھ (۱۶) مولانا ایچ ایم ملک، ناگ پور، (۱۷) خان بہادر کرنل عبدالمجید خان، پٹیالہ، (۱۸) خان بادر خواجہ یوسف شاہ امرتسر، (۱۹) خان بہادر میاں محمد شفیع لاہور (۲۰) خان بہادر شیخ علاغ صادق، امرتسر (۲۱) مولوی حافظ محمد زحمل خان دہلی، (۲۲) محمد احتشام علی رئیس کاکوری، اودھ (۲۳) سید نبی اللہ، ضلع آلہ باد (۲۴) خان دبار محمد مزمل اللہ خان، ضلع علیگڑھ، (۲۵) عبدالسلام خان، رام پور، (۲۶) خان بہادر محمد مزمل اللہ خان، ضلع علیگڑھ، (۲۷) حاجی محمد اسماعیل خان، علی گڑھ، (۲۸) صاحبزادہ آفتاب احمد خان، علی گڑھ، (۲۹) نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین ضلع مراد آباد، (۳۰) مولوی حبیب الرحمان خان رئیس حبیب گنج علی گڑھ، (۳۱) نواب سید سرور علی خان، بمبئی (۳۲) خلیفہ سید محمد خان بادر، پٹنہ، (۳۳) مولوی سید کرامت حسین آلہ باد (۳۴) مولوی شریف الدین، پٹنہ بہار، (۳۵) مولوی سید مہدی علی خان، محسن الملک (۲۰۴)

اس شملہ وفد نے وائسرائے راج شملہ میں سر سلطان محمد شاہ آغا خان کی قیادت میں لارڈ منٹو سے

ملاقات کی اور وفد کے قائد آغا خان نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو لارڈ منٹو کو مندرجہ ذیل امور پر مبنی عرضداشت پڑھ کر سنائی۔

۱۔ مسلمانوں کو بلحاظ آبادی کے تناسب سے انکی سماجی اہمیت اور مقامی اثر ورسوخ کی وجہ سے ڈسٹرک اور میونسپل بورڈ میں جداگانہ بنیادوں پر نمائندگی دی جائے۔

۲۔ مسلمان اراکین کو یونیورسٹیوں کی گورنگ باڈیز میں بھی مناسب نمائندگی کی یقین دہانی کرائی جائے۔

۳۔ صوبائی کونسلوں میں بھی مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات کی بنیاد پر نمائندگی دی جائے اور اس مقصد کے لیے خصوصی انتخابات کے ذریعے مسلمان جاگیرداروں، تاجروں، دوسرے شعبوں کے نمائندہ افراد یونیورسٹی گریجوایٹس اور اس طرح کے دوسرے ڈسٹرکٹ اور میونسپل بورڈز کے ممبران میں سے انتخاب کیا جائے۔

۴۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں مسلمان نمائندگان کی تعداد بلحاظ آبادی نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اس طرح مسلمان نمائندے امپیریل کونسل میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے اور اقلیت بدل جائیں گے۔ جس حد تک ممکن ہو ایسے نمائندے بذریعہ چناؤ شامل ہونے چاہئیں کیونکہ ہم نمائندوں کی نامزدگی کی بات نہیں کرتے اس مقصد کے لیے انتخابات مسلمان جاگیرداروں، وکلاء تاجروں صوبائی کونسلر کے ممبران اور یونیورسٹی فیلوز میں سے ہونے چاہئیں۔ (۲۰۵)

سر آغا خان نے عرضداشت کو سارے پس منظر کے ساتھ ان نہایت تاریخی اہمیت کی باتوں کو غور سے پڑھا۔ انہوں نے کہا کہ

> ''نمائندگی کے کسی بھی طریقے کا محدود یا غیر محدود میں ایک اقلیت کو جو اپنے وجود میں کسی بھی طرح یورپ کی درج اول کی قیادت (ماسوائے روس کے) بلحاظ تعداد زیادہ ہے اسے مناسب نمائندگی سے محروم نہیں رکھا جا سکتا بلکہ وہ ملک کے انتظام کا بھی ایک اہم حصہ ہے اس لیے کسی بھی شعبے میں مسلمانوں کو ان کی تعداد کے تناسب سے نمائندگی دینے کی بجائے ان کی سیاسی اہمیت اور مقام کے حوالے سے نمائندگی دی جانی چاہئے''(۲۰۶)
>
> انتخابات کے نظام کا حوالہ دیتے ہوئے سر آغا خان نے کہا ''انتخابات کا یورپی نظام ہندوستان کے لوگوں کے لیے بالکل نیا ہے۔ آج کے نظام انتخاب میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی امیدوار کا نام منظوری کے لیے انتخابی باڈیز کی جانب سے بھیجا گیا ہو ایسا محض اسی صورت میں ممکن ہوتا ہے کہ جب امیدوار کی زیادہ وابستگیاں اور ہمدردیاں اہم مسائل ہی کے ساتھ ہوں''۔ (۲۰۷)

اس وفد نے حکومت کے مختلف شعبوں مثلاً عدالتوں میں مسلمانوں کی کم نمائندگی کا ذکر کیا اس بات کا ذکر بھی کیا گیا کہ مسلمان اس بات کا اظہار بہت دکھ سے کرتے ہیں۔مسلمان ججز کو ہائی کورٹ اور چیف کورٹس میں اکثر نمائندگی سے محروم رکھا جاتا ہے۔اس وجہ سے یہ صورتحال ہے کہ ایک بھی مسلمان جج ان عدالتوں میں موجود نہیں ہے جب کہ اس کے برعکس تین ہندو جج کلکتہ ہائی کورٹ اور دو چیف کورٹ پنجاب میں متعین ہیں جبکہ ان صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔(۲۰۸)

وفد کی ان معروضات کو سننے کے بعد وائسرائے ہند لارڈ منٹو نے نہایت ہمدردانہ انداز میں کہا کہ:

> ''میں ذاتی طور پر آپ لوگوں کے تمام مطالبات کا احترام کرتا اور انہیں اہمیت دیتا ہوں'' وائسرائے نے یہ بھی کہا کہ آپ لوگ دیکھیں گے کہ بہت جلد ہندوستان کے حالات میں تبدیلی آئے گی۔آپ لوگ ایسے وقت میں مجھ سے مخاطب ہیں کہ سیاسی فضاء تبدیل ہو رہی ہے۔ان حالات میں تبدیلی سے نظریں چرانا بے وقوفی ہوگی۔آپ لوگوں کے خیال سے متفق ہوں اور آپ کی عرضداشت سے متاثر ہوں کہ کوئی بھی ایسی نمائندگی نہیں ہونی چاہئے جس میں براعظم کی کسی بھی قوم کی تاریخی واپسی اور اعتقادی حیثیت کو سامنے نہ رکھا جائے۔ لارڈ منٹو نے اپنے جواب میں گویا ایک طرح سے صلح جوئی والا انداز اپنایا اور کہا میں اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ مسلمانوں کے لیے علیحدہ حیثیت کا تعین ضروری ہے۔میونسپل بورڈ ہو یا ڈسٹرکٹ بورڈ یا مجلس قانون مسلمانوں کے لیے علیحدہ حیثیت کا تعین بہرحال ضروری ہے''۔(۲۰۹)

مارلے منٹو اصلاحات ۱۹۰۹ء

مرکوزہ سیاق وسباق کے ساتھ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے سیاسی افق پر مزید تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ان تبدیلیوں میں سے منٹو مارلے اصلاحات قابل ذکر ہیں۔۱۹۰۶ء کے نصف آخر میں مارلے نے دستوری اصلاحات کی نئی قسط ترتیب دینے کی طرف توجہ مبذول کی۔وہ وائسرائے سے رابطہ میں تھا۔منٹو نے تفصیلات پر غور کرنے اور ایک مراسلہ تیار کرنے کے لئے ایک ذیلی مجلس ۱۹ مارچ کو لندن بھیج دی۔ اس مراسلہ نے ان اصلاحات کی بنیاد کا کام کیا جنہیں آئین مجلس ہند مجریہ ۱۹۰۹ء کے ذریعے قانونی شکل میں ڈھالا گیا۔اس دستور کے ذریعے صوبائی مجالس بڑے صوبوں میں سے زیادہ سے زیادہ ۵۰ اراکین جبکہ چھوٹے صوبوں میں ۳۰ اراکین تک کا اضافہ کیا گیا۔انتخابی طریقہ کار جزوی طور پر بلاواسطہ اور کہیں بلواسطہ کیا گیا۔صوبائی مجالس میں چھوٹی چھوٹی غیر سرکاری اکثریتوں کا بندوبست کیا گیا مگر مرکز میں ایک سرکاری اکثریت قائم رکھی گئی وائسرائے اور اس کی کابینہ انتظامیہ کے علاوہ ۴۰ اراکین کا مرکزی مجلس قانون ساز میں

اضافہ ہوا۔ اس مجلس کے اراکین کو انتظام حکومت اور حکمت عملی کے مسائل پر بحث کرنے کی اجازت تھی۔ مگر ایوان میں حکومت کی مستقل آئینی اکثریت تھی۔ وزیر ہند مارلے نے یہ دلیل پیش کی کہ مرکزی مجلس قانون ساز میں ایک مستقل سرکاری اکثریت قائم رکھنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ ''اس کی ترکیب اپنی قانون ساز اور عاملہ دونوں نوعیّتوں میں برابری ہونی چاہئے، کہ اسے ان ذمہ داریوں کے پورا کرنے کا مستقل اور مکمل اختیار حاصل ہو جو اس پر ملکہ معظّمہ کی حکومت اور شاہی پارلیمنٹ کی طرف سے عائد ہوتی ہیں اور ہمیشہ عائد ہونی چاہئیں۔(۲۱)

منٹو مارلے ریفارمز ۱۹۰۹ء میں وائسرائے کے لیجسلیٹو (قانون ساز کونسل) میں نشستوں کی تعداد ۱۶ سے بڑھا کر ۶۰ کر دی گئی۔ ان ساٹھ اراکین میں سے ۲۷ اراکین براہ راست منتخب کئے جاتے تھے اس کے علاوہ صوبائی لیجسلیٹو (قانون ساز کونسل) کی تعداد بھی بڑھا دی گئی۔ یوں صوبوں میں مسلمانوں کو علیحدہ نمائندگی کا حق دیا گیا۔(۲۲)

نئی کابینہ کو حکومت کے حوالے سے بے جا تنقید کا اختیار نہیں دیا گیا۔ سوالات کرنے کی اجازت تھی مگر انھیں بغیر وجہ کے مسترد کیا جا سکتا تھا۔ قراردادیں پیش کی جا سکتی تھیں مگر حکومت انھیں منظور کرنے کی پابند نہیں تھی۔ المختصر کہ اس بات کی ضمانت کے لئے پوری احتیاط سے کام ہوا کہ حکومت اپنی کارروائیوں سے متعلق ہندوستانی قانون سازوں کی ہر بات کو وضاحت کردے کہ ترقی کا جو عمل شروع ہوا، اس کا موازنہ اس سے نہیں کرنا چاہئے جو انگلستان اور نوآبادیات سے متعلق ہے۔ ان مجالس کو اب تک بنسبت پارلیمنٹوں کے ''دربار'' زیادہ سمجھا جاتا تھا۔ مارلے نے دارالامرا کو بتایا کہ اگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصلاحات کا یہ باب ہندوستان میں پارلیمانی نظام کے قیام کی طرف بلاواسطہ یا لازماً رہنمائی کرتا ہے تو جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا''(۲۳)

مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ اہم تبدیلی مارلے منٹو اصلاحات کی بدولت ہوئی جس کے تحت کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب قائم ہو گئے، شملہ وفد کا مطالبہ مان لیا گیا اور جداگانہ مسلم نمائندگی کے نظام کا اجرا ہو گیا۔ بیشتر ہندوؤں نے اور برطانوی مشاہدوں نے یہ کہا کہ فرقہ وارانہ حلقہ ہائے انتخاب کی تخلیق جمہوری اصولوں کی خلاف ورزی ہے مگر مارلے نے مسلمانوں کے ان دلائل کو سمجھ لیا تھا کہ مسلم نشستوں کا انحصار ہندوؤں کی آرا پر کر دینے سے ہندو مسلم تعلقات میں تلخی آجائے گی اور اس کا نتیجہ ایک شہریت کے بجائے خلیج کی صورت میں سامنے آئے گا کیونکہ ہندو رائے کبھی مسلمانوں کے حق میں نہیں آسکتی تھی۔ اس جدید طریقہ کی

حمایت میں ایک دلیل یہ تھی کہ یہ ایک بڑی قوم کا متفقہ مطالبہ تھا۔ مارلے جداگانہ حلقہ ہائے انتخابات کو وجود میں لانے کی منظوری دے کر خود اپنے عقائد کی خلاف ورزی نہیں کر رہا تھا۔ حکومت ہند سے متعلق اس کے خیالات کا جمہوریت سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اصولی طور پر بھی یہ عمل حقیقی جمہوریت کے منافی قرار پاتا کہ مسلم مفاد کی نگرانی ایک ایسی بے تخیل اور تنگ نظر اکثریت کے حوالے ہوتی جس میں مسلم ملت کا احساس کبھی پیدا نہ ہوتا۔ ہندو سیاست دانوں اور کانگریس نے اس پر تنقید کی اور مخالفانہ مہم شروع کر دی۔ کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۱۰ء میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ نمائندگی کی آئینی دفعہ کے خلاف مزمت کا اظہار کیا اور مطالبہ کیا کہ ''حق رائے دہی کے معاملے میں ملک معظم کی رعایا کے مختلف فرقوں کے درمیان اس قسم کی بے قاعدہ حد بندیوں'' کو دور کیا جائے''(۲۴)

۱۹۰۹ء میں کونسل کے ممبران کی تعداد میں اضافہ کر کے چھ کر دیا گیا۔ خارجہ امور کا محکمہ شروع سے ہی گورنر جنرل کے پاس تھا۔ باقی تمام محکمہ جات مثلاً ہوم، آئن سازی، مالیات، زراعت و مالیہ، رفاہ عامہ، تجارت، صنعت و حرفت، دوسرے ممبران کے پاس تھے۔ حکومتی انتظامات کا مسلمہ اصول یہ تھا کہ تمام تر معاملات کی آخری ہدایات اور کنٹرول تاج برطانیہ کے پاس ہوگا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کی ابتداء میں گورنر لیفٹیننٹ گورنر کے صوبوں کے اندر مجالس آئین ساز بنائی گئیں تاہم انہیں پبلک قرضہ، کسٹم، پوسٹ، اینڈ ٹیلی گراف، کرنسی، فوجداری قانون، مذہبی قانون، بحری اور فوجی امور، پیٹنٹ کاپی رائٹ کے معاملات میں آئین بنانے کی قطعاً ممانعت تھی۔ اسکے علاوہ تمام صوبائی نظم و نسق کے شعبہ جات مرکز کے پاس تھے کوئی بھی نئی قانون سازی مرکز کی اجازت کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی۔☆

☆ عذرا وقار، تحریک پاکستان اور نوائے وقت، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۴۵۳۔

مرکزی مجلس آئین سازی کا دائرہ کار اور عمل دخل بہت زیادہ وسیع تھا۔ وہ فوجداری پولیس جیل خانوں، جنگلات، کانوں، فیکٹریوں، حفظان صحت، تعلیم وغیرہ سے متعلق تمام قوانین بنا سکتی تھی۔ اس بات کا کوئی تعین بھی نہیں تھا کہ کن امور پر مرکز آئین بنا سکتا ہے اور کون سے امور صوبوں سے متعلق ہیں۔ بعض معاملات مثلاً امور خارجہ، دفاع، جنرل ٹیکسیشن، قرضہ، کرنسی، ٹیرف، پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف، انشورنس، پیٹنٹ کاپی رائٹ، آتش گیر مادے، ریلوے، اکاؤنٹس اینڈ آڈٹ وغیرہ پر مکمل کنٹرول مرکز کا تھا۔☆

☆ عذرا وقار، تحریک پاکستان اور نوائے وقت، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی،

اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ص ۴۵۳-۴۵۴۔

صوبوں کو عام طور پر صوبائی انتظام و انصرام پولیس سول اور فوجداری عدالتوں، جیل خانوں مالیہ کی تخصیص اور وصولی، تعلیم، میڈیکل، صحت عامہ، تعمیرات عامہ، سڑکیں اور رجنگلات میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں پر اختیارات حاصل تھے۔ تاہم اس کے باوجود مرکز کو صوبوں کے معاملات پر کنٹرول حاصل تھا۔ تمام شعبہ جات میں پالیسی وضع کرنا مرکز کا کام تھا اور صوبوں پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ وہ مرکز کی ہدایات کی روشنی میں آئین سازی کریں اور صوبے کا نظم و نسق چلائیں۔ اس کے علاوہ مرکز وقتاً فوقتاً تحقیقاتی کمیشن مقرر کرتا تھا۔ جنکے ذمہ پولیس، تعلیم، زراعت، آثار قدیمہ اور قحط وغیرہ کے متعلق تحقیقات کرنے صوبوں کو مشورے اور ہدایات دینے، نئی آسامیوں کا تقرر، ملازمتوں میں گریڈ، بنیادی تنخواہ، پنشن، رخصت کے قواعد و ضوابط اور پبلک ورکس کے قواعد کو بھی مرکز ہی وضع کرتا تھا اور صوبوں کو ان پر کاربند ہونا پڑتا تھا۔☆

☆ عذرا وقار، تحریک پاکستان اور نوائے وقت، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۴۵۴۔

۱۹۰۹ء کے گورنمنٹ آف ایکٹ کے ذریعے صوبوں کو صوبائی امن و قانون اور نظم و نسق کا اختیار سونپا گیا۔ صوبائی ٹیکسوں کے اندر تخصیص کر دی گئی۔ اسکے علاوہ صوبائی مجالس آئین ساز کو پبلک قرضہ، کسٹم ڈیوٹی یا ان ٹیکسوں کے بارے میں جن کو مرکز نے لاگو کیا ہے دخل دینے کی اجازت نہیں تھی۔ بری، بحری اور ہوائی فوجوں، امور خارجہ یا وہ امور جو مرکزی قرار پائیں ان میں صوبائی مجالس دخل اندازی نہیں کر سکتی تھی۔☆

☆ عذرا وقار، تحریک پاکستان اور نوائے وقت، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۴۵۴۔

سائمن کمیشن رپورٹ جو کہ ۱۹۳۰ میں چھپی تھی جسکے حصہ اول میں ہندوستان کے سیاسی، معاشی، معاشرتی مسائل کو اجاگر کیا گیا جبکہ حصہ دوم میں آئینی تجاویز دی گئیں اسی رپورٹ کے حصہ اول میں سائمن کمیشن نے دی مارلے منٹو سکیم کو یوں بیان کیا۔

لہٰذا معاملات جاری رہے جب تک کہ لارڈ مورلی سیکریٹری ریاست بن گیا جب کہ لارڈ منٹو وائسرائے تھا۔ ۱۹۰۹ کے مورلی-منٹو اصلاحات کی بدولت بہت اہم پیش رفت ہوئی۔ صوبائی قانون سازی کونسلوں میں سرکاری اکثریت کو معاف کر دیا گیا تھا. ان مباحثوں کا سائز زیادہ سے زیادہ ۵۰ اضافی "بڑے بڑے صوبوں میں اور ۳۰ چھوٹے صوبوں میں ہوئے اور ان اضافی ممبروں کا بڑا حصہ غیر سرکاری تھا جو مقامی گروپوں یا بڑے

زمینداروں کے ذریعہ منتخب ہوئے تھے۔

تجارتی ریونیو اور یونیورسٹیوں میں بنگال میں، پورے صوبے کی اکثریت کا انتخاب کیا گیا تھا۔یقینی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان کمیونٹی کو خاص طور پر نمائندگی دی جانی چاہیے (علاوہ پنجاب، برما اور مرکزی صوبوں) کے علاوہ دو سے پانچ ممبران ہر کونسل کے علاوہ، الگ الگ ووٹ سے منتخب مسلم امیدوار اس فیصلے کی مکمل اہمیت یہ ہے کہ جب اس کو یاد رکھا جائے کہ مسلمانوں نے دوسرے انتخابی کالجوں کی طرف سے کی جانے والی انتخاب پر اثر انداز کرنے کا موقع بھی لیا تھا،لیکن بات یہ تھی کہ مشترکہ انتخابی اداروں کو کبھی بھی ایسے نمائندوں کا انتخاب نہیں کرے گا جو مسلمان کمیونٹی کے لئے تسلی بخش ہو ہم نے اس دوسری جگہ پر لارڈ منٹو کی بنا پر اعلان کیا ہے۔ لارڈ مارلے نے بہت زیادہ اور واضح طور پر، مسلمان کے دعوی کو قبول کیا ہے؛ اور یہاں ایک الگ انتخابی رول کے ووٹ پر مبنی کمیونٹی کو نمائندگی سے کی اس شناخت کا آغاز ہوا جو اس دن سے باقی ہے اور ہندوستانی انتخابی نظام کے ہر تناظر میں ایک اہم مسئلہ اور تنازعے کی بنیاد بن گیا ہے'' (۱۷۷)

شملہ وفد اور مختلف اخبارات کا اظہار:

مسلمانوں کے ایک وفد کی عرضداشت کو اور وائسرائے کے حوصلہ افزا جواب کو کانگریسی اخبارات نے بجائے مثبت انداز سے دیکھنے سے متعصّبانہ نظر سے دیکھا۔ کانگرس نواز اخبارات نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ حکومت برطانیہ کو مسلمانوں کے مطالبات سن کر ان پر ہمدردانہ غور کرنے سے براعظم کی قومیتوں کا استحصال کر رہی ہے۔ کانگریس رہنماؤں کو فکر لاحق ہوگئی کہ حکومت مسلمانوں کے لیے بھی اصلاحات کر رہی ہے اس کے ساتھ ''امرت بازار پتر کا'' اخبار نے مسلمانوں کے اس وفد کی اہمیت کو نہایت کمتر پیش کرنے کی خاطر یہاں تک لکھ دیا کہ وفد حکومت کے اشارے پر وائسرائے ہند سے ملا ہے اس لیے اس کو''کل ہند'' وفد کا نام نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس معاملے میں اخبار ''بنگالی'' نے بھی کئی مخالفت بھرے اداریے تحریر کیے اور تجویز دی کہ مسلمانوں کو جداگانہ کوشش کی بجائے اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر کوشش کرنی چاہئے لیکن مسلمانوں نے ہندو مسلم بھائی چارے کو پس پشت ڈال دیا ہے اس اخبار نے اپنے اداریے میں اس وفد میں شامل مسلمان رہنماؤں اور اہل علم لوگوں کی اہمیت کو بیان کیا اور پھر ایک دوسرے حوالے سے وفد کی کامیابی کو نیچا دکھانے کے لیے کہا ''اس قدر پائے کے مسلمان رہنماؤں اور اہل دانش لوگوں کو وائسرائے ہند کا جواب مطمئن کرتا ہوا دکھائی نہیں دیتا بلکہ وائسرائے کے جواب سے مسلمانوں میں مایوسی کی لہر دوڑ جائے گی''۔

ایک اخبار ''بنگالی'' نے لکھا کہ وہ یہ'' وفد دراصل ایجوکیشنل تحریک کا ثمر ہے اس وفد جو عرضداشت پیش کی وہ بڑی اعتدال پسندی اور متانت کا کرشمہ تھی۔ مسلمانوں نے چناؤ کے لیے محض نامزدگی کو ناپسند کیا ہے اس کے

ساتھ ہی جداگانہ انتخابات پر زور دیا ہے۔ مسلمانوں کے لیے جداگانہ نشستوں کا انتخاب نہ صرف ناقابل حفاظت ہوگا بلکہ اس سے سیاسی طور پر کسی سنجیدہ قسم کی مشکلات پیدا ہوں گی''۔(۲۱۰)

اینگلو انڈین پریس نے کانگرسی اخبارات کے رویہ کے برعکس مسلمانوں کے مطالبات اور وائسرائے کے جواب اور یقین دہانی کو مثبت اور حقیقی سیاسی روح کا آغاز کی طرف پہلا قدم قرار دیا اور کہا کہ دنیائے جدید کی نئی سیاست کے لیے ایسا ہی رویہ ہونا چاہئے۔ لارڈ منٹو اور وائسرائے ہند ذاتی طور پر خود اس وفد کی ماروداے اور اس کے جواب میں اپنے طور پر مطمئن تھا کہ اُس نے مسلمانوں کے وفد کو ملاقات کے دوران مثبت جواب دیا ہے۔ نیز اس کے علاوہ وائسرائے ہند کے علم میں ''امرت بازار پتر کا'' بنگالی کے متعصّبانہ رویہ کو پیش کیا گیا تو اس نے ان اخبارات کی عادات کو پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا۔ بعض اخبارات نے وائسرائے ہند کے ان جذبات کو مثبت انداز میں پیش کیا۔ نواب محسن الملک نے اپنے اس وفد کی ملاقات کے بارے میں ڈنلپ سمتھ کو بتایا کہ مسلمانانِ ہند اپنے مؤقف کے اظہار اور وائسرائے ہند کی حوصلہ افزائی کی اور مطالبات کی اہمیت کو ماننے کی وجہ سے پرامید ہیں۔(۲۱۱)

قائداعظم کی کانگرس میں شمولیت:

قائداعظم محمد علی جناحؒ کی کانگریس میں شمولیت اور کانگریس رہنماؤں کے تاثرات ہندوستان میں سیاست میں دھڑے بندیوں کی وجہ سے قائداعظم نے آئینی مسائل کو حل کرنے کے لیے دو بڑی قومیتوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکٹھا کرنے کا عزم کیا۔ وہ سیاسی میدان میں پرعزم ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر قانون دان بھی تھے جس کی وجہ سے ہندوستان اور دیگر اقوام انہیں عزت کی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ قائداعظم نے ۱۹۰۴ء میں کانگریس میں شمولیت اختیار کی ان کی شمولیت پر کانگریس کے معزز رہنما نے یوں تعریفی کلمات کہے:

''جناح کا خمیر صحیح مٹی سے اٹھایا گیا ہے اور فرقہ وارانہ تعصب سے مبرا ہونے کی صفت انہیں ہندو مسلم اتحاد کا بہترین سفیر بنادے گی''(۱۹)

مسٹر سروجنی نائیڈو نے بھی اسی قسم کے الفاظ میں ان کی تعریف کی اور موتی لعل نہرو نے مسٹر نائیڈو کا ہمنوا ہو کر کہا:

''اکثر مسلمانوں کے برعکس وہ اتنے ہی پرجوش قوم پرست ہیں جتنا کہ ہم میں سے کوئی ہوسکتا ہے۔ وہ اپنی قوم کی ہندو مسلم اتحاد کی سمت رہنمائی کررہے ہیں''۔(۲۰)

مسلم لیگ کے موقف میں تبدیلی

۱۹۰۶ء میں کانگرس نے نوآبادیات کی قرارداد منظور کی جبکہ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے الغرض جس قدر مسلمان تعلیم وتجارت میں ہندوؤں سے بہت زیادہ پیچھے تھے اسی قدر مسلم لیگ کانگرس سے بہت پیچھے تھی۔☆

☆ عذرا وقار، تحریک پاکستان، ص ۷

مشترکہ اقتصادی اور سیاسی ضروریات کے نتیجے میں کانگرس اور مسلم لیگ ایک دوسرے کے قریب آ گئیں۔☆

☆ عذرا وقار، تحریک پاکستان، ص ۸

۱۹۱۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے دستور میں تبدیلی کی گئی اور (Suitable Self Governament) مسلم لیگ کا مطمع نظر ٹھہرا۔ اس بناپر قائداعظم محمد علی جناح کو مسلم لیگ کے نزدیک آنے میں آسانی پیدا ہوئی۔(۱۴)

آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو لایا گیا تھا۔ ابتداء میں مسلمانوں کی یہ جماعت اعتدال پسند سیاستدانوں پر مشتمل تھی اور اس کا دائرہ کار صرف اور صرف مسلمانان ہند کے حقوق کا تحفظ تک محدود تھا تاہم جداگانہ انتخابات کا حصول مسلم لیگ کی کوششوں کی بدولت ہی ہوا تھا۔☆

☆ احمد سعید، حیات قائداعظم چند نئے پہلو، ص ۳۰۔

۱۹۱۰ء میں ملک میں جو حالات پیدا ہوئے ان حالات کی وجہ سے مسلم لیگ کے سیاسی موقف میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس تبدیلی کی بدولت مسلم لیگ اور کانگریس ایک دوسرے کے قریب آنے لگیں۔ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ و کانگریس میں قریب آنے کی وجوہات میں سے ایک بڑی اور خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۹۱۳ء میں ہی مسلم لیگ نے اپنی پالیسی میں نمایاں طور پر تبدیلی کی یعنی پہلی دفعہ ۱۹۱۳ء میں ایک قرارداد کے ذریعے ''مناسب حکومت خوداختیاری'' کا مطالبہ بھی کیا۔ یہ قرارداد کانگریس کے مقاصد کے زیادہ قریب تھی اس وجہ سے مسلم لیگ اور کانگریس ایک دوسرے کے قریب ہوگئیں۔ اب مسلم لیگ نے حکومت کی ہمنوائی کی پالیسی کو چھوڑ دیا اور اپنے اغراض ومقاصد میں وقت کے لحاظ سے تبدیلی پیدا کرلی اور مسلم لیگ کا آزاد گروہ جس کی قیادت مسٹر محمد علی جناح کر رہے تھے اور مسلم لیگ اس کے زیرسایہ آنے لگی۔ جناح شروع سے ہی ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اس بناپر وہ مسلم لیگ میں شرکت کرنے پر رضامند ہوگئے۔ اس کے بعد دونوں پارٹیوں یعنی مسلم لیگ اور کانگریس کے اجلاس ایک ہی مقام پر منعقد ہوتے رہے اور مسٹر جناح نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کرنا شروع کردیا۔(۱۵)

(۱۴) احمد سعید، حیات قائداعظم چند نئے پہلو، قومی ادارہ برائے تحقیق، تاریخ وثقافت، مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی

اسلام آباد، ۲۰۰۹ء ص ۳۰

(۱۵) ایچ۔بی۔خان، *برصغیر پاک وہند کی سیاست میں علماء کا کردار*، قومی ادارہ برائے تحقیق، تاریخ وثقافت، مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۷ء ص ۱۲۸۔۱۲۹

قائداعظم کی مسلم لیگ میں شمولیت:

قائداعظم کا سیاسی فلسفہ عدم تشدد تھا جو ان کی سیاسی جدوجہد میں نظر آتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۱۳ء میں اس یقین دہانی کے تحت مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی کہ ان کی وفاداری کسی بھی صورت میں تقسیم نہیں ہوگی۔ اس سے مسلم لیگ کی فراخدلی کا پتہ چلتا ہے۔ مسلم لیگ نے ایک سال قبل اپنے سالانہ اجلاس ''جس کا انعقاد لکھنو میں ہوا اس پالیسی کا اظہار کیا تھا جب کہ قائداعظم نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار نہیں کی تھی۔ مذکورہ اجلاس میں مسلم لیگ نے کانگریس کی ایک نہایت معتبر ومشہور خاتون رکن مسز سرجنی نائیڈو کو مہمان خصوصی کی حیثیت دی تھی اور انہیں سٹیج پر بٹھایا تھا۔

مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس بیک وقت بمبئی میں منعقد ہوتے تھے۔ دونوں جماعتوں کے اجلاس تھوڑے فاصلے پر ہوتے تھے۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے کے اجلاس میں باآسانی شرکت کر سکتے تھے اب ایسے محسوس ہوتا تھا کہ تقسیم بنگال گزرا ہوا واقعہ بن چکی ہے۔ قائداعظم ابھی تک کانگریس کے اہم رکن اور فرقہ وارانہ اتحاد کے علمبردار تھے مسلم لیگ میں شمولیت کے صرف دو سال بعد وہ مسلم لیگ کے صدر بن گئے۔ ایسی جماعت کا صدر بننا یہ ظاہر کرتا تھا کہ لیگ ''معاف کردو اور بھول جاؤ'' کی روشن راہ پر سفر کر رہی تھی۔ (۲۱)

یکم جنوری ۱۹۱۶ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کا آٹھویں اجلاس جو کہ بمبئی میں عبدالحسین آدم کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جسکی صدارت مظہر الحق نے کی اس اجلاس کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جسکے ذریعے اصلاحات سکیم مرتب کرنا تھا جسکی سفارشات آل انڈیا مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس میں پیش ہونا تھیں۔ یہ کمیٹی ا۷ ممبران پر مشتمل تھی جو کہ برٹش انڈیا کے تمام صوبہ جات سے اسکے ممبران کو چنا گیا۔ یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی بلاشبہ یہ جناح کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ (☆)

☆ Prof Dr Riaz Ahmad, All India Muslim League and the Creation of Pakistan 1906-1947,

۱۰/۱اکتوبر کو لکھنو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل میں جناح کو آئندہ سیشن کے لیے صدر منتخب کیا گیا۔

۳۱-۳۰ دسمبر آل انڈیا مسلم لیگ کے نویں اجلاس میں جو کہ لکھنو میں منعقد ہوا جسکے چیرمین نبی اللہ اور جناح اسکے صدر تھے۔ کانگریس کے کئی اراکین نے اس اجلاس میں شرکت کی اس اجلاس میں مشترکہ اصلاحات سکیم منظور کر لی گئی جو کہ کانگریس اور لیگی اراکین نے مرتب کی تھی جسے عرف عام میں لکھنو پیکٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سکیم کو انڈین نیشنل کانگریس نے بھی منظور کیا تھا۔ بلاشبہ اس پیکٹ کے حقیقی معمار جناح تھے۔ (☆)

☆ Prof Dr Riaz Ahmad, All India Muslim League and the Creation of Pakistan 1906-1947,

میثاق لکھنؤ (مسلمانوں اور ہندوؤں کی مصالحت):

بمبئی میں مسلم لیگ کے منعقدہ اجلاس میں اعتماد حاصل کرنے کے بعد قائداعظم پوری تندہی سے اپنے کام میں مگن ہو گئے۔ یکم جنوری ۱۹۱۶ء کو انہوں نے مسلم لیگ کے اجلاس میں آئینی اصلاحات کی ترتیب کے لیے کمیٹی کے قیام کی قرارداد پیش کی۔ اس کمیٹی کا کام دوسری سیاسی جماعتوں کے مشورے کے ساتھ آئینی اصلاحات کی ترتیب تھی جو کہ متحدہ ہندوستان کے نام پر متفقہ مطالبات کی بنیاد بن سکیں۔ یہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوئی اور اس کی وجہ سے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے مسلم لیگی رہنماؤں کی کمیٹی کی تشکیل ہوئی دوسری جانب کانگریس نے بھی ایک کمیٹی قائم کی اور موتی لعل نہرو اس کے سربراہ بنے۔ اس کمیٹی کا اجلاس اپریل ۱۹۱۶ء میں الہ آباد میں نہرو کی رہائش گاہ پر ہوا۔ اس اجلاس میں جو فیصلے ہوئے ان کی بنیاد پر قائداعظم نے وہ تاریخی دستاویز مرتب کی جس کو ''میثاق لکھنؤ'' کے نام سے شہرت ملی۔ دونوں گروپوں نے قیصر باغ لکھنو میں اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۶ دسمبر ۱۹۱۶ء میں اس کو باضابطہ منظور کیا اور لکھنو پیکٹ کے نام موسوم ہو گیا۔ (۲۲)

اس پیکٹ نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخابی حلقوں کی توثیق کی اور مختلف کونسلوں کی مجموعی تعداد میں مندرجہ ذیل تناسب سے نمائندگی دی گئی نشستوں کی تقسیم اس طرح رکھی گئی کہ ہر صوبہ میں اقلیتی گروہ کو اس کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی ملے تاکہ اس کی آواز پر اثر ہو سکے۔

مدراس ۱۰ فیصد

مرکزی صوبہ جات ۱۰ فیصد

بہار اور اڑیسہ ۲۵ فیصد (۵۰ فیصد)

متحدہ صوبہ جات ۳۰ فیصد

بمبئی ۳۳ فیصد

بنگال ۴۰ فیصد

پنجاب ۵۰ فیصد

ایکٹ ۱۹۰۹ء کے مندرجات کے مقابلے میں اس پیکٹ کے ذریعے مسلمانوں کو جو مزید نشستیں ملیں ان کے بدلے میں مسلمان عام حلقوں میں ووٹ دینے کے خصوصی اختیار سے دستبردار ہو گئے (مرکز) میں اپیریل لیجسلیٹو کونسل کے منتخب ہندوستان اراکین ایک تہائی تعداد مسلمانوں کو دی گئی۔ مرکزی قانون ساز لیجسلیٹو اسمبلی کی نشستیں بھی علیحدہ حلقہ ہائے انتخابات کے ذریعے پر کئے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مذکورہ پیکٹ میں یہ شرط عائد کی گئی کہ اگر کسی گروہ کے بارے میں کوئی ایسا بل آیا اس کی کوئی شق، یا کسی غیر سرکاری رکن کی طرف سے پیش کی گئی کسی قرارداد کی مخالفت اس کونسل میں مذکورہ کونسل کے تین چوتھائی ارکان کریں گے تو وہ منظور نہیں کی جائے گی۔ معاہدے کی تائید میں قائداعظم نے مسلم لیگ لکھنو کے اجلاس میں جو خطبہ پڑھا اس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ اس کی شرائط پر صدق دل سے عمل کرنا چاہتے تھے۔ قائداعظم نے اپنی تقریر میں اور باتوں کے علاوہ یہ بات بھی کہی کہ:

> ''پورا ملک تقدیر کا فیصلہ سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہے اور پر امید نظروں سے گوش بر آواز ہے۔ وہ نئے آفاق کا متلاشی ہے۔ خلوص، اعتماد اور عزم صمیم ارض ہند میں ہر سو تابندہ ہیں۔ ہر طرف زندگی متحرک ہے۔ اگر ہندوستان کے مسلمان ملک کی پکار پر لبیک نہ کہہ سکے اور اس امید میں برابر کے شریک نہ ہوئے جس سے آج ہر محبّ وطن سرشار ہے تو وہ خود سے اور اپنی ماضی کی روایات سے بے وفائی کے مرتکب ہوں گے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے معزز ساتھیو! آپ یہ بات یاد رکھیں کہ آپ کی قوم کی بلکہ پورے ملک کی نظریں اس وقت آپ پر لگی ہوئی ہیں۔ اس تاریخی ہال اور مسلم لیگ کے اس عہد ساز اجلاس میں آپ جو فیصلہ کریں گے وہ اپنی تمام تر قوت وشدت کے ساتھ اپنے لیے وہ جگہ پیدا کرے گا جس کے سات کروڑ مسلمان ہند کے منتخب نمائندے اور رہنما جائز طور پر دعویدار ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان کے مستقبل کا، ہندوستان کے اتحاد کا اور آئین کے بارے میں ہمارے مشترکہ خیالات اور امنگوں کا انحصار ان فیصلوں کی نوعیت پر ہے''(۲۳)

قائداعظم نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ ''وہ ایک کٹر کانگریسی ہیں، انہیں فرقہ وارانہ نعروں سے کوئی دلچسپی نہیں اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ متحدہ ہندوستان کی تشکیل کے لیے مسلم لیگ ایک قومی عامل کی

حیثیت اختیار کر رہی ہے''۔(۲۴)

لکھنو پیکٹ کی بصیرت و جامعیت کے متعلق کوپ لینڈ نے کہا کہ''نیشنلزم میں اب تک جو پیش رفت ہوئی تھی لکھنو پیکٹ اس کا سب سے نمایاں مظہر تھا''اور یہ معاہدہ ثبوت تھا کہ ہندوستانی سیاستدانوں کا ذہن صرف ناقدانہ اور غیر تعمیری سوچ کا حامل ہی نہیں تھا۔کچھ عرصہ پہلے انگریز ہندوستان کو ایسا ملک قرار دے رہے تھے جو ایسے طبقات، نسلوں اور گروہوں کا مجموعہ ہے جن کے درمیان مفادات اور موروثی احساسات کی وسیع خلیج حائل تھی۔تاہم اب ان کے پاس ایسی بات کے علاوہ کوئی دوسرا حل نہیں تھا کہ وہ آئینی مسائل کے لیے باہمی تعاون اور مظاہروں کی اہمیت کو تسلیم کریں۔انگریز اس بات پر راضی نہ تھے کہ وہ اس ساری کوشش کو ہندوستان کے لیے نو آبادیاتی درجہ کا حصول قرار دیتے۔مذکورہ تمام رکاوٹوں اور دشواریوں کے باوجود لکھنو پیکٹ ہندوستان کو اپنی سیاسی منزل کے قریب لانے کی کوششوں میں مؤثر کوشش ثابت ہوا۔(۲۵)

علامہ سید سلمان ندوی جن کے علم و فضل اور تقوی سے کسی کو انکار نہیں ان کے علم و فضل کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ انہیں استاد الکل کہہ کر پکارتے تھے۔اور آپ کے نوازش نامہ کو قوت روح اور تسلیٔ دل باعث قرار دیتے تھے علامہ سید سلیمان ندوی نے ۱۹۱۶ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مشہور زمانہ لکھنو پیکٹ کے موقع پر ایک نظم کہی تھی اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نگاہ میں قائد اعظم کا مرتبہ کیا تھا۔یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ پیکٹ صحیح معنوں میں قائد اعظم محمد علی جناح کی کوششوں کی بدولت ہی بنا تھا اور اس موقع پر جی کے گوکھلے نے قائد اعظمؒ کو ہندو مسلم اتحاد کا سفیر قرار دیا تھا۔ علامہ سید سلیمان ندوی کی نظم کچھ یوں ہے:

ایک زمانہ تھا کہ اسرارِ دروں مستور تھے
کوہ شملہ جن دنوں ہم پایہ سینا رہا ہے
جبکہ داروئے وفا ہر دور کا درماں رہی
جبکہ ہر ناداں عطائی بو علی سینا رہا
جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اسے
جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا
بادۂ حب وطن کچھ کیف پیدا کر سکے
دور میں یوں ہی اگر یہ ساغر و مینا رہا
علت دیریں سے گو اصلی قویٰ بیکار ہیں

گوش سنوا ہے نہ ہم میں دیدۂ بینا رہا
پر مریضِ قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید
ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا☆

☆ احمد سعید، حیات قائداعظم چند نئے پہلو، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، مرکزِ فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، ص ص ۱۳۶-۱۳۷۔

ابتداء میں قائداعظم محمد علی جناح کا نام محمد علی جینا (محمد علی جناح) ہی لکھا جاتا تھا۔☆

☆ احمد سعید، حیات قائداعظم چند نئے پہلو، ص ۹۳۔

۱۹۱۶ء میں جب مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین مشہور زمانہ میثاق لکھنو کے موقع پر راجہ صاحب محمود آباد نے مسلم لیگ اور کانگریس کے سرکردہ وزیٹرز (Visitors) کے لیے مقام لکھنو ایک دعوت کا اہتمام کیا جس کے اندر ایک سو پچاس سے زائد مہمانان گرامی نے شرکت کی تھی۔ اس موقع پر ملک معظم کی صحت کی خوشی میں جام صحت نوش کرنے کے بعد جناح صاحب نے کانگریس اور سریندر ناتھ بینرجی نے لیگ کے لیے صحت کے لیے جام تجویز اور نوش فرمایا تھا۔(۲۶)

محاصل

قائداعظم شروع سے ہی ہندو مسلم اتحاد کے خواہاں تھے۔ انہیں اس بات کا پورا یقین تھا کہ ہندوستان کی ترقی کا راز ہندو مسلم اتحاد میں مضمر ہے۔ وہ جانتے تھے کہ تاج برطانیہ پر ہندو مسلم اتحاد کے بغیر دباؤ کی بھی صورت میں نہیں بڑھایا جاسکتا۔ وہ چاہتے تھے کہ دونوں اقوام کو متحد کر کے انکی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تاج برطانیہ کو مجبور کیا جائے کہ وہ ہندوستانیوں کی خواہش کے مطابق آئینی اصلاحات کا نفاذ کریں۔ مسلم لیگ نے سیاسی موقف میں جو تبدیلی پیدا کی اس نے قائداعظم محمد علی جناح کو اس بات کا موقع فراہم کر دیا۔ قائداعظمؒ نے مسلم لیگ میں شمولیت کے بعد مسلم لیگ اور کانگرس کو قریب کرنے کے لیے بہت جدوجہد کی۔ انکی اس جدوجہد کا مقصد یہ تھا کہ ہندو اور مسلم دونوں اقوام مل کر آئندہ آئینی اصلاحات کے لیے تاج برطانیہ پر دباؤ بڑھا سکیں اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ دونوں اقوام کے درمیان ایک سمجھوتہ طے پا جائے کہ دونوں کے حقوق محفوظ ہو جائیں اور آپس کی نفرتیں ختم ہو جائیں۔ بلا شبہ جناح صاحب کی کوششوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مشہور زمانہ میثاق لکھنو طے پایا۔ جسکی بدولت پہلی دفعہ ہندوؤں نے

مسلمانوں کے جداگانہ انتخابات کو تسلیم کر لیا اور اس کی بدولت اسکو آئینی حیثیت حاصل ہوگئی۔اب دونوں اقوام نے بلا خوف وخطر نئی آئینی اصلاحات کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

حوالہ جات

(۱۳۳) پروین روزینہ جمعیت علمائے ہند، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، ص ۶۶۲ ایضاً، ۲۰۱۶ء، ص ۷۹۳

(۱۳۴) ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر روشن آرا راؤ، تاریخ تحریک پاکستان، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، طبع اول ص ۳۷-۳۸

(۱۳۵) پروین روزینہ، جمعیت علمائے ہند، جلد دوم، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثاقت مرکز فیضیلت قائداعظم یونیورسٹی نیو کیمپس اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، جلد دوم، ص ۶۷۰

(۱۳۶) ایضاً ص ۶۷۸

(۱۳۷) ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر روشن آراء راؤ، تاریخ تحریک پاکستان، مقتدر قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۳۸

(۱۳۸) ایضاً ص ۳۸، ۳۹

(۱۷۴) Indian Statory Commission, Vol I, Calcutta, Government of India Central Publication branch, 1930, Page 115

(۲۰) ایچ بی خان، برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار، قومی ادارہ برائے تحقیق، تارکی وثقافت مرکزی فضیلت قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد طبع دوئم ۲۰۱۷ ص ۵۵

(۱) Farah Gul Baqai, Jenkins and the Partition of Punjab 1947, NIHR, Islamabad, 2019, p. 12.

(۹) اے۔ڈی۔مضطر، خاکسار تحریک اور آزادی ہند، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص ۲

Indian Statory Commission, Vol I, Calcutta, Government of India Central Publication branch, 1930, Page 114-115

(۱۷۵) Ibid Page 116-117

(۱۷۶) Ibid Page 117

(۱۰) ڈاکٹر محمد عارف، تحریک پاکستان پروگریسو پبلشرز لاہور اگست 1994ء ایضاً ص ۸۳-۸۵

(۱۸۵) ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان، تاریخ وسیاست، جنگ پبلشرز لاہور، اگست ۱۹۹۲ء، ص ۱۷

(۱۸۶) پروفیسر محمد رفیع انور، حسن عسکری رضوی، تحریک قیام پاکستان، علی کتاب خانہ اردو بازار لاہور، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۷۳ء، ص ۵۲

(۱۷۸) ڈاکٹر خالد اقبال یاسر، جدید تحقیقات اور اقبال، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۲۰۱۵، ص ۱۷۱

(۱۷۹) ایضاً ص۴۳۸

(۱۸۰) ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی، زوال سے اقبال تک، مرکز مطالعات جنوبی ایشیاء پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۳۸

(۱۸۱) داور خان داؤد، رنگہائے پشتو ادب قومی ادارہ برائے تحقیق، تاریخ و ثقافت مرکز فضیلت، قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۷، ص ۴۷

(۱۸۲) محمد رفیق افضل، گفتار اقبال، ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور، جنوری ۱۹۶۴ء، ایضاً ص ۱۷۔۱۸

(۱۸۳) ایضاً ص ۱۸۔۱۹

(۱۸۴) ایضاً ص ۱۹

(۱۸۵) ڈاکٹر صفدر محمود، پاکستان، تاریخ و سیاست، جنگ پبلشرز لاہور، اگست ۱۹۹۲ء، ص ۱۷

(۱۸۶) پروفیسر محمد رفیع انور، حسن عسکری رضوی، تحریک قیام پاکستان، علی کتاب خانہ اردو بازار لاہور، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۷۳ء، ص ۵۲

(۱۸۷) پروین روزینہ، جمعیت علمائے ہند، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثافت مرکز فیضیلت قائداعظم یونیورسٹی نیو کیمپس اسلام آباد، ۲۰۱۶ء، جلد دوم، ص ۸۱۲

(۱۸۸) جاوید اقبال، زندہ رود (۱)، حیات اقبال کا تشکیلی دور، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۵، ۱۲۶

(۱۸۹) ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ڈاکٹر روشن آرا راؤ، تاریخ تحریک پاکستان مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۱۱۹، ۱۲۰

(۱۹۰) ایضاً ص ۱۲۰

(۱۹۱) ایضاً ص ۱۲۰۔۱۲۱

(۱۹۲) ایضاً ص ۱۲۲۔۱۲۳

(۱۹۳) محمد احمد خان، اقبال کا سیاسی کارنامہ، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۲۸

(۱۹۴) جاوید اقبال، زندہ رود (۱) حیات قبال کا تشکیلی دور، شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ پبلشرز لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۶

(۱۹۵) محمد احمد خان، اقبال کا سیاسی کارنامہ، اقبال اکادمی لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۳۲

(۱۹۶) ایچ بی خان، برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ، ثقافت مرکز فضیلت قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۶۵۔۶۶

(۱۹۷) ایضاً ص ۶۶۔۶۷

(۱۹۸) ایضاً ص ۶۷

(۱۹۹) ایضاً ص ۶۷۔۶۸

(۲۰۰) ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر روشن آراء راؤ، تاریخ تحریک پاکستان، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۱۱۱

(۲۰۱) ایضاً ص ۱۱۵

(۲۰۲) ایضاً ص ۱۱۵

(۲۰۳) محمد علی چراغ، تاریخ پاکستان، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۲۳۱-۲۳۲
(۲۰۴) ایضاً ص ۲۳۲، ص ۲۳۴
(۲۰۵) ایضاً ص ۲۳۴، ص ۲۳۵
(۲۰۶) ایضاً ص ۲۳۴، ص ۲۳۵
(۲۰۷) ایضاً ص ۲۳۵
(۲۰۸) ایضاً ص ۲۳۵-۲۳۶
(۲۰۹) ایضاً ص ۲۳۶
(۲۱) اشتیاق حسین قریشی، جدوجہد پاکستان، ص ۴۲-۴۳
(۲۲) Farah Gul Baqai, Jenkins and the Partition of Punjab 1947, National Institute of History and Cultural Reserach Centre of Excellence, Quaid-i-Azam University, Islamabad, Pakistan, 2018, P 12
(۲۳) اشتیاق حسین قریشی، جدوجہد پاکستان، ایضاً ص ۴۳-۴۵
(۲۴) ایضاً ص ۴۴-۴۵
(۱۷۷) Indian Statory Commission, Vol I, Calcutta, Government of India Central Publication branch, 1930, Page 117-118.
(۲۱۰) ایضاً ص ۲۳۷-۲۳۸
(۱۶) ڈاکٹر محمد عارف، تحریک پاکستان پروگریسو پبلشرز لاہور اگست ۱۹۹۴ء، ص ۸۶، ص ۸۷
(۱۷) ایضاً ص ۸۸
(۱۸) ایضاً ص ۸۸
(۱۹) ایضاً ص ۸۸-۸۹
(۲۰) ایضاً ص ۸۹
(۲۱) ایضاً ص ۸۹، ۹۰
(۲۲) ایضاً ص ۹۰
(۲۳) ایضاً ص ۹۰-۹۲
(۲۴) ایضاً ص ۹۱، ص ۹۲
(۲۵) ایضاً ص ۹۲
(۲۶) احمد سعید، حیات قائداعظم چندنئے پہلو، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت، قائداعظم یونیورسٹی، ۲۰۰۹ء، ص ۶-